جلد ۲۶ شمارہ ٦

اشاعت خصوصی دسمبر ۷۷ء

ماہنامہ میثاق لاہور

مشتمل بر

علّامہ اِقبال مرحُوم

حیات ○ فلسفہ ○ پیغام

تحریر : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ اقبال اور حب رسولؐ

تحریر : محترمہ جمیلہ شوکت صاحبہ

عدل اجتماعی اور قرآن حیکم

تحریر : مولانا محمد طاسین صاحب

یکے از مطبوعات

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳٦ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور (فون : 352611)

چندہ سالانہ -/۱۵ قیمت فی نسخہ -/۲

مہ اقبال کا ایک خواب

جو ھنوز شرمندہ تعبیر ہے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

قرآن اکیڈمی

کا قیام ان شاء اللہ العزیز اس خواب کی تعبیر کا ظہور ہوگی !

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک تحریر سے اقتباس جو لاہور کے ایک روز نامہ میں شائع ہوئی ۔

”علامہ مرحوم کی شدید خواہش تھی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں جدید تعلیم یا فتہ نوجوانوں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق قرآن حکیم کے علم و حکمت کا درس دیا جائے ۔ اپنے ایک عقیدتمند چوھدری نیاز علی مرحوم کے سامنے جب علامہ نے اپنی اس آرزو کا ذکر بار بار کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ اس مقصد کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ کچھ زمین وقف کرنے کو تیار ہیں بلکہ تعمیر کا سارا بار بھی خود ہی برداشت کر لیں گے ۔ چنانچہ یہی سکیم تھی جس کے پیش نظر مشرقی پنجاب کے ضلع گرداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ میں سرنا ریلوے سٹیشن سے متصل 'دارالاسلام' کی تعمیر عمل میں آئی ۔ علامہ مرحوم نے ایک خط عالم اسلام کی قدیم ترین و عظیم ترین درسگا لازہر کے ریکٹر کو لکھا کہ ہمیں ایک ایسا عالم دین فراہم کیجئے جو جد فکر و فلسفہ سے بھی آگاہ ہو اور جدید تعلیم یا فتہ نوجوانوں کو انگریزی زبا میں وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن حکیم کا درس دے سکے ۔ لیکن افسوس کہ وہاں سے معذرت موصول ہوگئی کہ ان کے پاس مطلوبہ معیار ک کوئی عالم دین موجود نہیں اور اس طرح اس سکیم پر عمل کا آغاز ہی نہ ہو پایا ۔ کیا خوب فرمایا ہے علامہ مرحوم کے مرشد معنوی حضرت اکبرالہ آبادی نے :

هدیہ سالِ اقبال ۱۹۷۷ء

علامہ اقبال مرحوم

○ حیات ○ فلسفہ ○ پیغام

از قلم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

من جانب

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

(فون: ۳۵۲۶۱۱)

تقدیم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقید حیات تھے۔ پروفیسر صاحب نے ”اقبال کا پیغام“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانح حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لئے اولاً ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لئے خود لکھی تھی اور ثانیاً ’پیغام اقبال‘ کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر ’مثنوی اسرار و رموز‘ کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا —— پروفیسر صاحب کی ان گنت تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آ گئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرما دی چنانچہ اسے اوّلاً ماہنامہ ’میثاق‘ لاہور کے تین شماروں (مئی تا جولائی ۶۹ء) میں شائع کیا گیا —— اور اب یہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی جانب سے ہدیۂ سال اقبال کے طور پر پیشِ خدمت ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں، تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدرے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بگوش اور عقیدتمند کے قلم سے نکلی تھی اور ان شاء اللہ قارئین ’میثاق‘ میں سے وہ حضرات بھی اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جو علامہ مرحوم کے حالاتِ زندگی سے بخوبی واقف ہیں خود علامہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد، اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکرین پر جو نوٹ ضمناً اس مضمون میں آ گئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ان سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں مستحضر رکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی تھی۔ چنانچہ بہت سی باتیں جو اس میں بصیغۂ حال بیان ہوئی ہیں کب کی قصۂ ماضی بن چکیں۔ چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے —— اس میں بھی ایک خزانہ عبرت پنہاں ہے ع

”جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ“

اسرار احمد

حیاتِ اقبال

سوانح علامۃ العصر ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال مدظلہٗ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ جن کی گوت "سپرو" تھی۔ وہ ایک باکمال ولی اللہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے اور اس ولی کا روحانی تصرف آج تک اس خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسنِ عقیدت جس نے سپرو کو شیخ بنا دیا، ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسی لئے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں۔ مثلاً :

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ   بُتے می تراشد ز سنگ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ والدین نے اقبال نام رکھا۔ میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہو گا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحبِ اقبال ہو گا۔ اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا۔ جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔

ابتداءً مکتب میں داخل ہوئے اس کے بعد سکول میں نام لکھایا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کر کے مقامی (مرے کالج) میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحبؒ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاذ کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا، فیضِ صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت شدہ تھا۔ لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

غالباً شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام النّادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علامہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چشموں میں معروف اور ممتاز رہے۔

اسی سال آپ اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے۔ دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔

جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن نے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دور میں ڈاکٹر آرنلڈ[۳] کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو مدّۃ العمر باقی رہا آرنلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ "جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسّر آ جائے، وہ رفتہ رفتہ محقق بن جاتا ہے"

ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اور زیادتی ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے[۴]۔ کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ شام کی گاڑی سے لاہور واپس آئے۔ دوران قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علما اور فضلا کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ[۵]۔ ڈاکٹر براؤن[۶]،

ڈاکٹر نکلسنؒ اور ڈاکٹر سارلےؒ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ پہلے انارکلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصہ سے میکلوڈ روڈ پر قیام ہے۔ اقبال کی وجہ سے مجھے اس سڑک سے وہی وابستگی ہے۔ جو مجنوں کو کوئے لیلیٰ سے تھی۔

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پریکٹس کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل دماغ، فلسفیانہ مزاج صوفیانہ افتادِ طبع اور عالمانہ طرزِ زندگی رکھتا ہو، جو (VISIONARY IDEALIST) ہو۔ جس کی توجہ تمام تر ملتِ اسلامیہ کی بہبود پر مبذول رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بہت سا وقت (REALITY، EGO) کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرارِ خودی کا مصنف ہو اُسے ”نظائرِ دیوانی“ اور ”امثلۂ فوجداری“ سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے ؟

۱۹۲۳ء میں سرکارِ برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کبھی خطابات یا اعزازات کے لئے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دُنیا میں رہتے ہیں جہاں SERVANT اور SIR دونوں یکساں نظر آتے ہیں ؎

بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر، ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ء سے سمجھنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف احباب اور کالج کے طلبہ تک محدود تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء

میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا ۔

غالباً دوستوں نے مشورہ دیا ہوگا کہ آپ کو کسی باکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ استاذ بہرحال خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہوگا ۔ بہرکیف آپنے بلبل ہند نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی ، استاد اعلیٰ حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کرلیجئے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لئے بھیجیں ۔

تلمّذ کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا ۔ ہاں بقول آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ " اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی "، اقبال کی خوش نصیبی کہ اُسے داغ جیسا زباندان اور کامل الفن استاد ملا ، اور داغ کی بلند بختی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا ۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ " داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے ۔"

اقبال نے خود بھی ایک غزل کے مقطع میں ، داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں   مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

سب سے پہلے لاہور میں ، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپنے جو غزل پڑھی اسکا مقطع یہ ہے :

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض   ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ جو شعراء قوموں کو زمزمہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زمانی دونوں قیود سے آزاد ہوتے ہیں ۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز دہی کرلی جو اُن کے لئے مناسب تھی ۔ یعنی ۱۹۰۸ء سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہوگئی ۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ نے " خون شہداء کی نذر "، کے عنوان

سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کر دی۔ جس وقت آپنے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا، آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔ والا مضمون ہے۔ ہر آئندہ نظم سوز دردی کی آئینہ دار ہے۔

علامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متأثر کرتی ہے وہ ان کی عدیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس، سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو غرضکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں ('PLAIN LIVING AND HIGH THINKING'،)

دوسری بات یہ ہے کہ علاّمہ کا در فیض ہر کس و ناکس کے لئے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے، اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو بآسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک اسلام علیکم کہہ کر خوان علم و فضل کی زلّہ ربائی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاغندا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملت اسلامیہ کی بہبود کی تدابر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟

؏ شہرت شعرشش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں جس نے

بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکار دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں !!!

یوں تو ہر شاعر پُر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوز عشق مصطفےٰؐ سے مالا مال ہیں اسی لئے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لئے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت اُلفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ کی پرستش کرتا انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذبات محبت کی قدرے ترجمانی کرتی ہے۔

۱۹۲۶ء میں آپ اپنے عقیدت مندوں کے اصرار سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے آمادہ ہوئے عموماً امیدوار ہزار ہا روپیہ خرچ کرتے ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ ووٹر کی خوشامد وظیفۂ حیات بن جاتی ہے۔ لیکن اہل لاہور جانتے ہیں کہ اقبال بغیر "منتِ مخلوق" کامیاب ہوا تھا۔

کونسل میں آپ نے برابر تین سال تک ملک اور قوم کی گراں بہا خدمت انجام دیں جن کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

دسمبر ۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کے لئے مدعا کیا۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیئے جو ۳۰ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔

وہاں سے آپ میسور، بنگلور ہوتے ہوتے حیدر آباد دکن آئے۔ یہاں کی علمی مجلسوں کو نوازا۔ اور طالبان علم کی پیاس بجھائی۔

دسمبر ۳۰ء سرکار برطانیہ نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کر کے لندن بھیجا۔

دہم جنوری ۱۹۳۱ء کو محمد علی کا انتقال ہوا۔

اکتوبر ۳۲ء میں تیسری کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔

ماہ دسمبر ۳۲ء میں لندن میں ر 'SOCIETY ARISTOTELIAN'· ل کے سالانہ

جلسہ میں ایک معرکۃ الآرا مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے

'IS RELIGION POSSIBLE ?'

اس سفر میں آپ نے اسپین کا بھی دورہ کیا اور عربوں کی عظمت رفتہ کے آثار غرناطہ اور قرطبہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ فروری یا مارچ ۳۳ء میں واپس آئے۔

(واضح ہو کہ یہ مضمون ۳۳ء میں لکھا تھا اس لئے یہیں ختم ہو گیا۔)

حواشی

۱؎ فقیر راقم الحروف نے دوران قیام سیالکوٹ میں علامہ موصوف کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ تقریب بہر ملاقات یوں ہوئی کہ میں نے ایک دن اپنے مکرم و محترم مولوی احمد دین صاحب مرحوم (والد بزرگوار حضرت اثر صہبائی مرحوم) سے عرض کی کہ میں والد علامہ اقبال، مولانا میر حسن اور علامہ عبدالحکیم مرحوم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ فرمانے لگے میرے ساتھ چلو ان سب سے ملا دوں گا۔ چنانچہ ان کی معیت میں علامہ موصوف کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتوار کے دن، کوئی گیارہ کا عمل ہو گا، ہم دونوں پیدل روانہ ہو کر اس بزرگ کی خدمت میں جا پہنچے۔ شیخ صاحب موصوف کی عمر دسمبر ۱۹۲۸ء میں اسی اور نوے کے درمیان ہوگی، ۸۵ سے بہر حال کم نہ تھی۔ بصارت اور سماعت دونوں میں فرق آگیا تھا)۔ مولوی صاحب نے مجھے متعارف کیا۔ میں نے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج میں نے اس شخص کو دیکھا جس کے گھر اقبال جیسا بلند اقبال پیدا ہوا۔ جس نے ارسطو اور افلاطون کی صف میں اپنے لئے جگہ بنائی ہے جو فلسفہ مغرب کا ماہر ہونے کے باوجود نبی اُمّی کا شیدائی ہے جس کے زور کلام اور رفعت تخیّل نے مشرق اور مغرب دونوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے . . ." فرمانے لگے "یہ سب اللہ تعالےٰ کا فضل ہے۔ ذٰلک فضل اللہ الخ" پھر مجھے حقہ دیا میں نے ان کی خاطر سے دو چار کش لگائے۔ مولوی صاحب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نہایت ذہین اور طباع انسان تھے۔ جوانی میں ان کی دکان سیالکوٹ کے شرفا اور زندہ دل لوگوں کا مرکز تھی۔ وہ سر سیدؒ کے بڑے حامی تھے اور اگرچہ تعلیم برائے نام تھی لیکن علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے تو کوئی

شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی عامی یا کم سواد انسان ہے صورت ڈاکٹر اقبال سے بہت ملتی تھی۔ رنگ جوانی میں شہاب ہوگا اس عمر میں بھی رخساروں پر سرخی باقی تھی۔ معلومات عامہ کا چسکا پڑا ہوا کب چھوٹتا ہے۔ دوسروں سے اخبار پڑھوا کر سنتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۲ــ میں نے مولانا کو دسمبر ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر غالباً نوے سال کی ہوگی۔ بصارت سے محروم ہو چکے تھے لیکن بصیرت کافی حاصل تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی جوانوں کو درس عبرت دیتی تھی۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اردو، فارسی اور عربی کے نوک زبان تھے۔ میں نے نظیری کا ایک شعر پڑھا اور اس کے معانی دریافت کئے، فرمایا آپ تو ماشاءاللہ فارسی میں خاصی لیاقت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں تو کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے عرض کی کہ مقصود یہ ہے کہ شاگردی کا شرف حاصل ہو جائے۔ آپ اقبال کے استاد ہیں جس کی شاگردی کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ پس اگر آپ سے یہ نسبت حاصل ہو جائے تو فخر و مباہات کا ایک پہلو بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ جائے گا اور میں ہم چشموں میں یہ کہہ سکوں گا۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

میری گفتگو سے قدرے محظوظ ہوئے اور فرمانے لگے "میاں ہمیں بھی استادوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا چسکا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں شوق کشاں کشاں غالب کی خدمت میں دلی لے گیا تھا۔ اس وقت سیالکوٹ میں ریل نہیں آئی تھی اس لئے وطن سے انبالہ تک گھوڑے پر سفر کیا تھا۔ بعض موقعوں پر پیدل بھی چلنا پڑا۔ مگر شوق نے ساری منزلیں طے کرا دیں۔ مولانا کی دینداری اور علمیت کا حال بیان کر چکا۔ ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں۔ جوانی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا جب تک پیدل چلنے کی طاقت باقی رہی روزانہ بلاناغہ اپنی والدہ کی قبر پر جاتے رہے۔ ایک سیپارہ جاتے اور ایک آتے ختم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۵۶ سال تک جاری رہا۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۳ــ ڈاکٹر سر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ، سی آئی ای، ڈی لٹ، ایم اے، ۸۸ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے تھے۔ عجیب علم دوست اور ذہین فطین

اور بالغ نظر انسان تھا۔ عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی اور راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں سے نفرت نہیں تھی۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ دعوتِ اسلام جس کا ترجمہ سرسید کے ایما سے شیخ عنایت اللہ خلف شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ دہلوی نے کیا تھا ایسی کتاب ہے، جو دراصل ہمارے علماء کو لکھنی چاہیئے تھی لیکن بقول علامہ شبلیؒ ہمارے علماء اس سے کہیں زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً تکفیر اہل قبلہ، مسئلہ امتناع نظیر، مسئلہ امکان کذب، استنجا بالمدراؤ بالماء، حلّتِ غراب، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، قیام درمیلاد، صلوٰۃ قبل المنبر، جوازِ شیئاً لِلّٰہ، انہدام قباب، تقبیل الابہامین، استمداد عن القبور، احضار صورتِ محمدیؐ، ایصالِ ثواب وغیرہ۔

اس کتاب سے ان کے تبحّر علمی، وسعت معلومات اور اعلیٰ قابلیّت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

غالباً ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور آئے۔ یہاں انہوں نے تفسیر کبیر کے اقتباسات سے معتزلہ کے عقائد پر ایک رسالہ عربی زبان میں تالیف کیا تھا جو لیوزک LUZAC نے لندن ۱۹۰۳ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے یہ رسالہ ۱۹۲۵ء میں پڑھا تھا۔ چونکہ علم دوست تھے اس لئے انہیں علامہ اقبال سے خاص انسیت ہو گئی تھی اور علامہ کو بھی اُن سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک نظم بھی ان کی یاد میں لکھی ہے جس کا عنوان ہے۔ "نالۂ فراق"

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں ۔۔۔ آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سر زمیں

پوری نظم بانگِ درا صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اِن کی آخری تصنیف ('ISLAMIC FAITH') ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی اس کتابچے میں انہوں نے اپنے شاگرد (اقبال) کی خدمت میں بھی خراج تحسین ادا کیا ہے۔

۴ء راستہ میں دہلی میں قیام کیا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار پر کمال حُسن عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے اور کامیابی کے لئے دعا کی۔ یہ دعا ایک نظم کی صورت میں آج بھی باصرہ نوازی اور بصیرت افروزی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے اور بانگِ درا کے صفحہ ۹۷ پر مندرج ہے۔ پہلے بند میں توصیف ہے اس کے بعد التجا ہے:-

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے　　شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں　　کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھکو

فی الجملہ تمام نظم جذبات عالیہ سے معمور ہے ۔ ناظرین کتاب میں ملاحظہ فرمائیں ۔ اس نظم میں یہ شعر بھی تھا ۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا　　ملا ہے جن کے کرم سے یہ آستاں مجھ کو

مگر مطبوعہ نظم میں یہ شعر درج نہیں ہے ۔

۲؎ (DR. MCTAGGART) (۱۸۶۵ء/۱۹۲۳ء) کیمبرج میں فلسفہ کا پروفیسر تھا اس کے فلسفیانہ نظام کا اصطلاحی نام ONTOLOGICAL IDEALISM ہے ۔ اس کی فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ چونکہ خودی قائم بالذات اور ازلی ہے اس لئے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ جین دھرم کا بنیادی عقیدہ یہی ہے

۳؎ (DR. E. BROWN) تاریخ ادبیات ایران چہار جلد کے شہرہ آفاق مؤلف فارسی اور عربی کے بے نظیر محقق، نہایت شریف اور نیک نفس انسان، جس نے صدہا نوجوانوں کو سکالر اور ڈاکٹر اور نقاد بنا دیا کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے ۔ کثیر نادر الوجود فارسی مخطوطات اُن کے کتب خانہ میں موجود ہیں ۔ بابی اور بہائی مذہب کے متعلق ان کی معلومات لائق رشک تھیں ۔

۴؎ (DR. R.A. NICHOLSON) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں ۔ بقید حیات ہیں ۔ مولف تاریخ ادبیات عرب ۔ شعبہ تصوف سے خاص دلچسپی ہے کئی کتابیں اس موضوع پر تالیف کی ہیں زاویہ نگاہ تنگ اور غیر ہمدردانہ ہے ۔ اسرار خودی کا ترجمہ 'SECRETS OF THE SELF' کے نام سے شائع کر کے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے ۔

۵؎ (DR. SORLEY) کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاق کے پروفیسر ہیں ۔ عمر غالباً ۶۷ سال ہوگی ۔ ان کی مشہور تصنیف 'MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD' ہے ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو کیمبرج مدعو کیا تھا ۔

فلسفۂ اِقبال

علامہ اِقبال مرحوم بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کے فلسفہ کو عام طور پر "فلسفہ خودی" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ ان کا اصل فلسفہ ہے کیا!

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ علامہ کی معرکۃ الآرا مثنوی "اَسرارِ خودی" کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا ہے۔ لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ پروفیسر موصوف نے خود "اَسرارِ خودی" کو سمجھنے کے لئے اوّلاً ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم سے مدد لی جو اس وقت کیمبرج میں اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے (یہ ذکر ۱۹۱۸ء کا ہے)، اور پھر جب اس ساری تگ و دو کے باوجود وہ علاّمہ مرحوم کے فلسفہ کو اچھی طرح نہ سمجھ پائے تو انہوں نے خود علامہ سے رجوع کیا اور فرمائش کی کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبانِ انگریزی تحریر کر دیں۔ علامہ نے اس فرمائش کی تعمیل میں جو مضمون لکھا اسے پروفیسر نکلسن نے ('SECRETS OF THE SELF') کے شروع میں شامل بھی کر دیا جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذیل میں ایک تو اس تحریر کا وہ ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر چشتی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں کیا تھا اور دوسرے مثنوی اسرارِ خودی کا وہ خلاصہ بھی درج کیا جاتا ہے جو پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں خود مرتب کیا تھا۔

اس طرح یہ مضمون علاّمہ اقبال مرحوم کے فلسفے پر نہایت مختصر لیکن انتہائی جامع اور ساتھ ہی غایت درجہ عام فہم دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا انداز تمام تر معروضی ہے اور اس کے ذریعے علاّمہ مرحوم کے فلسفہ کو جیسا کچھ وہ ہے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس لئے اس میں کسی جگہ بھی اختلاف یا اتفاق کا اظہار نہیں کیا گیا —!!

اسرار احمد

۱- اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ

جو انہوں نے نکلسن کی فرمائش پر خود تحریر فرمایا

ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ خود خدا بھی اک فرد ہے۔ اگرچہ فرد کامل ہے۔ کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلّی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بدنظمی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ افراد کائنات کی تعداد معیّن نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات فعل مختتم نہیں ہے۔ ہنوز مراتب تکمیل طے کر رہی ہے اسی لئے اس کے متعلق کوئی بات حتمی اور ادعائی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے اس حد تک اس کو بھی فعلِ تخلیق میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں: "فتبارك اللہ احسن الخالقین"

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ، ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود ہے کہ وہ خدا یا حیات کلّی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹا دے۔

میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے "تخلّقوا باخلاق اللہ"، یعنی اپنے

اپنے اندر صفات الہیہ پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہوگا، اسی قدر اس کے اندر شان یکتائی اور رنگ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے خودی (EGO) ہے۔ اگرچہ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے۔ لیکن ابھی تک فرد کامل کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ فرد جس قدر خدا سے قریب ہوگا، اسی قدر کامل ہوگا۔ قرب الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے، بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے۔ حیات دراصل اک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان پر غلبہ پا کر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاصہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی حفاظت اور ترقی کے لئے اس نے آلات اور وسائل پیدا کر لئے ہیں۔ مثلاً حواس اور ادراک جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتی ہے۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن مادہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ حیات کے حق میں مفید ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

جب حیات یا خودی مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے خودی ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے " الایمان بین الجبر والاختیار" حیات جب تقرب الٰہی حاصل کر لیتی ہے تو اختیار کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے مختصر یہ کہ حیات یا خودی مرتبہ جبر سے مرتبہ اختیار تک پہنچے کا نام ہے۔

جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نام الیغو یا شخص یا خودی ہو جاتا ہے اور شخصیت جد و جہد کی مسلسل حالت سے عبارت ہے۔ شخصیت کا قیام اسی حالت کے تسلسل پر منحصر ہے اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطل

یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی اور یہ بات خودی کے حق میں سمِّ قاتل ہے۔ شخصیت (PERSONALITY) چونکہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لئے اس کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ اس جوہرِ بے بہا کو مسلسل سرگرمِ عمل رکھے اور وہ عمل ایسا ہو کہ خودی کی ترقی کا باعث ہو۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "عملِ صالح" کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔

مسلسل جدوجہد ہی زندگی ہے (ع۔ دوام ما ز سوزِ ناتمام است) جو شے شخصیت کو پیہم جدوجہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے اس لئے حسن یا اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو ضعیف یا معطل کرے وہ بُری ہے۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پہ پرکھنا چاہیئے۔

میں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیئے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اُس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پہ فائز کرنے کے لئے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے، اسی طرح "اسے غیر فانی بنانے کے لئے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبہ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لئے جدوجہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار و اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالتِ کاوشِ پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذاہب اور ایرانی تصوّف اس حالت کے لئے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالتِ کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی

کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالم برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کر لیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ ولڈن کار نے لکھا ہے حشر اجساد بھی عین قرین عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لئے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اُسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقیّد بالمکان زمانہ، اُس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لئے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ مقیّد بالزمان زندگی میں بھی، کبھی کبھی ہمیں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل 'آنی' ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا ——— جزو ذات بنانا عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شان انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے جو بات تمہیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے، وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لئے آنحضرتؐ کی

زندگی میں موجود ہے۔ اسی لئے اللہ تعٰ نے فرمایا" لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ " آپؐ نے اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

ہر کہ عشق مصطفےٰ ساماں اوست   بحر و بر در گوشۂ داماں اوست

تربیت خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستورِ الٰہی کی اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی، نیابت الٰہی دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں آکر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور عمل، جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لئے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں۔ لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانۂ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدرِ اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

'اَسرار خودی'

کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

علاّمہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے۔ لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لئے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱) شاعری علاّمہ کے لئے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعہ اظہار خیالات ہے۔ لکھتے ہیں :۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست   بت پرستی بت گری مقصود نیست[1]

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصوّر کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں، حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔

(۲) خودی اصلِ نظامِ عالم ہے اور تسلسل حیات استحکام خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔

چوں حیات عالم از زورِ خودی است   پس بقدر استواری زندگی است[2]

قطرہ چوں حرف خودی از بر کند   ہستی بے مایہ را گوہر کند[3]

(۳) خودی کی حیات و بقا، تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصل او در آرزو پوشیدہ است[4]

دل ز سوز آرزو گیرد حیات   غیر حق میرد چو او گیرد حیات[5]

زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد   شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد[6]

علم از سامان حفظ زندگی است   علم از اسباب تقویم خودی است[7]

۴۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر[8]
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست   اصل او را ز آب و باد و خاک نیست[9]
خاک نجد از فیض او چالاک شد   آمد اندر وجد و بر افلاک شد[10]

۵ - عشق کا طریقہ محمد عربیؐ سے سیکھنا چاہیئے ۔

در دل مسلم مقام مصطفےٰ است   آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است[11]
آنکہ بر اعدا در رحمت کشاد   مکہ را پیغام لاتثریب داد[12]
امتیازات نسب را پاک سوخت   آتش او ایں خس و خاشاک سوخت[13]
چوں گل صد برگ ما را بو یکیست   اوست جان ایں نظام و او یکیست[14]

۶ - بغیر آپؐ کی اتباع کے، خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی ۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار   تا کمند تو کند یزداں شکار[15]
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا   شرح اِنّی جاعلٌ سازد ترا[16]

(۷)، خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہوجاتی ہے اور ترقی نہیں کرسکتی ۔

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ   الحذر از منتِ غیر الحذر[17]
رزق خویش از نعمت دیگر مجو   موج آب از چشمۂ خاور مجو[18]
تا نباشی پیش پیغمبرؐ خجل   روز فردائے کہ باشد جاں گسل[19]
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز   آبروئے ملت بیضا مریز[20]

۸ - جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوجاتی ہے تو نظام عالم کو مسخر کرلیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود   ماہ از انگشت او شق می شود[21]
در خصومات جہاں گردد حکم   تابع فرمان او دارا و جم[22]

۹ - مسئلہ نفیٔ خودی اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوام غالبہ کے قویٰ ضعیف ہوجاتے ہیں اس لئے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے ۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی   کوتہ دستی بے دلی دوں ہمتی[۲۳]

۱۰ - افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لئے مضر ہے۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود   جانِ او وارفتۂ معدوم بود[۲۴]
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت   خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[۲۵]
قومہا از سکرِ او مسموم گشت   خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت[۲۶]

ا - ادبیات اسلامیہ بھی مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعرا اور ادبار کو چاہیئے کر ایسے مضامین سپرد قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میانِ کیسہات نقدِ سخن   بر عیارِ زندگی او را بزن[۲۷]
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است   چوں درخشِ برق پیش از تندر است[۲۸]
فکرِ صالح در ادب می بایدت   رجعتے سوئے عرب می بایدت[۲۹]

۱۲ - تربیت خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہیہ۔

(ا) اطاعت

در اطاعت کوش اے غفلت شعار   می شود از جبر پیدا اختیار[۳۰]
باطن ہر شے ز آئینے قوی   تو چرا غافل زیں ساماں می روی[۳۱]
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو   از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو[۳۲]

(ب) ضبط نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں   می شود فرماں پذیر از دیگراں[۳۳]
تا عصائے لا الٰہ داری بدست   ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست[۳۴]
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد   فارغ از بندِ زن و اولاد شد[۳۵]
می کند از ماسوا قطعِ نظر   می نہد ساطور بر حلقِ پسر[۳۶]

(ج) نیابت الٰہی

نائب حق ہمچو جان عالم است　　ہستیِ او ظلِ اسم اعظم است[۳۷]
از رموزِ جزو و کل آگہ بود　　در جہاں قائم بامر اللہ بود[۳۸]
نوع انساں را بشیر و ہم نذیر　　ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر[۳۹]
مدعائے علم الاسماستے　　سرِ سبحان الذی اسراستے[۴۰]
ذات او توجیہہ ذات عالم است　　از جلال او نجات عالم است[۴۱]

۱۳- حیات ملّی کا تسلسل، روایات ملّیہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنی ملّی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات پر قائم رہنا چاہیئے۔

اے امانت دار تہذیب کہن　　پشت پا بر مسلک آبا مزن[۴۲]

۱۴- مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیر ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبع مسلم از محبت قاہر است　　مسلم ار عاشق نباشد کافر است[۴۳]
تابع حق دیدنش نادیدنش　　خوردنش نوشیدنش خوابیدنش[۴۴]
قرب حق از ہر عمل مقصود دار　　تا ز تو گردد جلالش آشکار[۴۵]
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید　　تیغ او بر سینہ او آرمید[۴۶]
زندگی از طوف دیگر رستن است　　خویش را بیت الحرم دانستن است[۴۷]

۱۵- موجودہ عقل و خرد اور تہذیب دراصل جہالت اور سفاہت ہے۔ مسلمانوں کو اس مادّی تمدّن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیئے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لئے کمزور ہے۔

علم مسلم کامل از سوز دل است　　معنئ اسلام ترک آفل است[۴۸]
سوز عشق از دانش حاضر مجوے　　کیف حق از جام ایں کافر مجوے[۴۹]
دانش حاضر حجاب اکبر است　　بت فروش و بت پرست و بتگر است[۵۰]

(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ چنانچہ **مرشد رومی** کہتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را　　　اوست سید جملہ موجودات را[۵۱]

امام شافعی نے وقت کو سیف قاطع قرار دیا ہے۔ وقت دراصل حیات ہے اور کوئی شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سرّ ایں شمشیر چیست　　　آب او سرمایہ دار از زندگیست[۵۲]
پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود　　　قوت او از ہمیں شمشیر بود[۵۳]
تو کہ از اصل زماں آگہ نہ　　　از حیات جاوداں آگہ نہ[۵۴]
زندگی از دہر و دہر از زندگیست　　　لاتسبّوالدہر فرمان نبیؐ است[۵۵]
نغمۂ خاموش دارد ساز وقت　　　غوطہ در دل زن کہ بینی راز وقت[۵۶]

۱۷ ۔ آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ :-

(ا) عشق را از شغل لا آگاہ کن　　　آشنائے رمز اِلّا اللہ کن[۵۷]

(ب) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے۔ یعنی محمل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں۔ میں مثل شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدایا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہمدم عطا کر۔

خواہم از لطف تو یارے ہمدمے　　　از رموز فطرتِ من محرمے[۵۸]
تا بجانِ اُو سپارم ہوئے خویش　　　باز بینم در دل او روئے خویش[۵۹]

ترجمہ اشعار فارسی

۱ے ۔ اس مثنوی سے شاعری مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی بت پرستی یا بت گری مقصود ہے۔
۲ے ۔ چونکہ عالم کی حیاتِ زور خودی پر موقوف ہے اس لئے زندگی بقدر استواری ہے۔
۳ے ۔ جب قطرہ خودی کا سبق حفظ یاد کر لیتا ہے تو اپنی بے قیمت ہستی کو موتی میں تبدیل کر لیتا ہے۔

۴ زندگی تو جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے ۔

۵ دل سوزِ آرزو سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب وہ زندگی حاصل کرتا ہے تو غیرِ حق فنا ہو جاتا ہے ۔

۶ زندہ انسان کو تمنا کی نفی مردہ کر دیتی ہے (جس طرح ، اگر شعلے میں سوز کم ہو جائے تو وہ (آخر کار) افسردہ ہو جاتا ہے ۔

۷ علم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت کا سامان مہیا کرے اور خودی کی تقویم (پائداری) کے اسباب فراہم کرے ۔

۸ خودی محبت سے پائندہ تر ، زندہ تر ، سوزندہ تر اور تابندہ تر ہو جاتی ہے ۔

۹ عشق کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں ہوتا اس کی اصل پانی یا ہوا یا مٹی نہیں ہے مراد یہ ہے اس کی اصل مادی نہیں ہے ۔

۱۰ عشق کی بدولت نجد کی خاک میں تیزی اور پھرتی آگئی ۔ چنانچہ وہ وجد میں آئی اور افلاک کے اوپر جا پہنچی ۔

۱۱ مصطفیٰؐ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہماری آبرو مصطفیٰ ہی کے نام سے ہے ۔

۱۲ جنہوں نے دشمنوں پر رحمت کا دروازہ کھولا اور مکے کو لا تثریب کا پیغام دیا ۔ یعنی کہ آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا (مؤلف)

۱۳ انہوں نے نسب کے امتیازات کو بالکل فنا کر دیا ان کی تعلیم نے اس خس و خاشاک کو بھسم کر دیا ۔

۱۴ گلِ صد برگ کی طرح ہماری خوشبو بھی ایک ہی ہے ۔ وہیؐ اس نظام کی جان ہیں اور وہ ایک ہیں ۔

15 کیا تو عشقِ رسولؐ کا مدعی ہے ؟ اگر ہے تو پھر محبوب کی تقلید کر کے محکم ہو جا ۔ تاکہ تیری کمند یزداں کو شکار (گرفتار) کر سکے ۔

۱۶ تاکہ خدائے کعبہ تجھ پر نوازش فرمائے اور تجھے "انّی جاعل" کی شرح بنا دے ۔ یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام پر فائز فرما دے ۔

۱۷ حضرت عمرؓ کی طرح اونٹ سے خود نیچے اتر ۔ غیر کا احسان اٹھانے سے سو بار

اللہ کی پناہ

۱۸؎ اپنا رزق دوسرے کے دسترخوان سے مت ڈھونڈ۔ آفتاب کے چشمے سے پانی کی موج مت مانگ۔

۱۹-۲۰؎ تاکہ تو پیغمبر کے سامنے اس دن شرمندہ ہو جو بہت روح فرسا ہوگا اس لئے اللہ سے ہمت طلب کر اور دنیا کا مقابلہ کر۔ دستِ سوال دراز کر کے ملتِ بیضا کی آبرو زائل مت کر۔

۲۱؎ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اور چاند اس کی انگلی کے اشارے سے پھٹ جاتا ہے۔

۲۲؎ وہ خصوماتِ جہاں میں حکم (پنچ) بن جاتا ہے اور شاہانِ عالم اس کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔

۲۳؎ بے ہمتی سے صدہا امراض پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً کوتاہ دستی، بے دلی اور دوں ہمتی۔

۲۴-۲۵؎ چونکہ وہ (افلاطون) ذوقِ عمل سے محروم تھا اور اس کی جان وارفتۂ معدوم تھی اس لئے وہ موجودہ ہنگامے (کائناتِ خارجی) کا منکر ہو گیا اور اعیانِ نامشہود کا خالق بن گیا۔

۲۶؎ بہت سی قومیں اس کی شراب سے مسموم ہو گئیں اور سو گئیں اور اس لئے ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں۔

۲۷؎ اے وہ شخص کہ تیری تھیلی میں شاعری کی نقدی ہے۔ اس شاعری کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھ (کہ یہ شاعری سچی ہے یا کھوٹی)

۲۸؎ فکرِ روشن ہیں عمل کی طرف رہنما ہوتی ہے جس طرح بجلی کی چمک کڑک سے پہلے ہوتی ہے (اور اس کی طرف رہنما ہوتی ہے)

۲۹؎ تجھے لازم ہے کہ ادب میں فکرِ صالح سے کام لے اور اس کے لئے تجھے عربی شعر و ادب کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔

۳۰؎ اے غفلت شعار! اطاعتِ الٰہی کی کوشش کر۔ اختیار، جبر (اطاعت) سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۳۱؎ ہر شے کا باطن قانون ہی سے قوی ہوتا ہے تو اس سامان سے کیوں غافل ہے؟

۳۲؎ آئین کی شدّت کا شکوہ مت کر اور شریعت کی حدود سے باہر مت نکل۔

۳۳؎ جو شخص خود اپنے نفس پر حکمران نہیں ہے وہ ضرور دوسرے کا محکوم بن جاتا ہے۔

۳۴؎ جب تک لا اِلٰہ کا عصا تیرے ہاتھ میں ہے تو خوف کے ہر طلسم کو باطل کرتا رہے گا۔

۳۵؎ جو شخص بھی اقلیم لا میں آباد ہو گیا وہ عورت اور اولاد دونوں کی قید سے آزاد ہو گیا۔

۳۶؎ وہ ماسوائے اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے (اور) اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔

۳۷؎ نائبِ حق تو عالم کی رُوح کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی ہستی (دراصل) اسمِ اعظم کا ظل ہوتی ہے۔

۳۸؎ وہ جزو اور کُل (انسان اور خدا) کے رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس
جہاں میں قائم ہوتا ہے۔

۳۹؎ وہ نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر ہوتا ہے وہ سپاہی بھی ہوتا ہے سپہ گر بھی ہوتا
ہے اور امیر (سپہ سالار) بھی ہوتا ہے۔

۴۰؎ وہ عَلَّم الاسما کا مدعا اور مقصود ہوتا ہے اور سبحان الذی اسریٰ کا بھید ہوتا ہے۔

۴۱؎ اس کی ذات، ذاتِ عالم کی تشریح ہوتی ہے اور اس کے جلال سے عالم کی نجات
وابستہ ہوتی ہے۔

۴۲؎ اے تہذیب کہن کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک سے منحرف نہ ہو۔

۴۳؎ مسلمان کی طبیعت محبت کی بدولت غالب و فاتح ہے اور مسلمان اگر عاشق
نہیں ہے تو کافر ہے۔

۴۴؎ اس کا دیکھنا اور نہ دیکھنا تابع احکام حق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا کھانا پینا
اور سونا بھی۔

۴۵؎ اپنے ہر عمل سے قرب حق مقصود رکھ تاکہ تیری ذات سے اس کا جلال آشکار ہو۔

۴۶؎ جو شخص غیر اللہ کی خاطر تلوار کھینچتا ہے (جنگ کرتا ہے)، دراصل وہ اپنی تلوار
اپنے ہی سینے میں پیوست کرتا ہے۔

۴۷؎ زندگی تو دوسروں کے طواف یعنی ان کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا نام ہے اور
اپنے آپ کو بیت الحرم (کعبہ) سمجھنے کا نام ہے۔

۴۸؎ مسلمان کا علم سوزِ دل سے کامل ہوتا ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں غروب ہو جانے
والے یعنی فانی کو ترک کر دینا۔

۴۹ دانش حاضر سے سوزِ عشق مت طلب کرو۔ حق کی کیفیت اس کافر کے جام سے مت مانگو۔

۵۰ دانش حاضر تو حجابِ اکبر ہے۔ بت فروش، بت پرست اور بت تراش ہے۔

۵۱ جو اللہ تعٰ کے جمال کا عاشق ہے وہی تمام کائنات کا سردار ہے۔

۵۲ میں کیا بتاؤں کہ اس شمشیر کا راز کیا ہے؟ اس کی آب زندگی سے اپنا سرمایہ (اپنا وجود) حاصل کرتی ہے۔

۵۳ حیدر کا ہاتھ جو کہ خیبر گیر تھا، اس کی قوت اسی تلوار سے تھی۔

۵۴ تو کہ زمان کی اصل سے آگاہ نہیں ہے (اسی لئے) حیاتِ جاوداں سے آگاہ نہیں ہے۔

۵۵ زندگی دہر (زمان) سے ہے اور دہر زندگی سے ہے (اسی لئے نبیؐ کا فرمان یہ ہے کہ لَا تَسُبُّوا الدھر یعنی دہر کو بُرا مت کہو۔

۵۶ سازِ وقت، نغمہ خاموش رکھتا ہے اور اگر تو زمان کے راز سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے دل میں غوطہ لگا۔

۵۷ عشق کو شغلِ لا سے آگاہ کر اور الا اللہ کے رمز سے آشنا کر۔

۵۸ میں تو تیرے لطف و کرم سے ایک ہمدم کا طالب ہوں جو میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو۔

۵۹ تاکہ میں اپنا سوز اس کے دل میں منتقل کرسکوں اور پھر اس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

ضرور مطالعہ فرمائیں ڈاکٹر اسرار احمد کی اہم تالیف
علامہ اقبال اور ہم

مِلّت اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصہ رموز بے خودی

جس طرح خودی کے معنی تکبّر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں ۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے ۔

۱ ۔ ربط فرد و ملت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیئے ۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دور رہتا ہے"

فرد می گیرد ز ملت احترام　　　ملت از افراد می یابد نظام[۱]

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں

ہر کہ آب از زمزم ملت نخورد　　　شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد[۲]

انسان کے اندر "جوہر نوری" ہے ۔ قوّت ادراک اُسی کی ایک شعاع ہے ۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے ۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است　　　جزو او را قوّتِ کُل گیری است[۳]
در جماعت خود شکن گردد خودی　　　تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۴]

۲ ۔ ملّت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لئے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنا دیتے ہیں ۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکار مدینہ نے ۔

محفل انجم زجذب باہم است   ہستی کوکب زکوکب محکم است[۵]

نبیؐ افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نہ   زیں بتانِ بے زبان کمتر نہ[۶]

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تاسوئے یک مدعائش می کشد   حلقۂ آئیں بپایش می کشد[۷]
نکتۂ توحید باز آموزدش   رسم و آئینِ نیاز آموزدش[۸]

۳ - اسلام کے ارکان اساسی

(۱) اسلام کا رکنِ اوّل توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقل انسانی اسی توحید کی بدولت منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے؟ مومن میں دین حکمت، آئین، زور، قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات   چشم می بیند ضمیر کائنات[۹]
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود   کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۱۰]

ملتِ اسلامیہ کے لئے توحید بمنزلہ رُوح رواں ہے۔ اگر توحید کا تصور خارج کر دیا جائے تو ملتِ اسلامیہ لاشۂ بے جان رہ جائے گی۔

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ   ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ[۱۱]
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما   رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[۱۲]

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لئے ملت اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔

ملّت از یک رنگیٔ دلہاستے   روشن از یک جلوہ ایں سیناستے[۱۳]
قوم را اندیشہ ہا باید یکے   در ضمیرش مدّعا باید یکے[۱۴]

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے" اکرمکم عند اللہ اتقکم"۔

برنسب نازاں شدن نادانی است   حکم او اندر تن و تن فانی است [۱۵]
ملتِ ما را اساس دیگر است   ایں اساس اندر دل ما مضمر است [۱۶]
ما زنعمت ہائے او اخوان شدیم   یک زبان و یک دل و یکجاں شدیم [۱۷]

یاس و حزن و خوف اُم الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی ناامید نہ ہو۔ کیونکہ ناامیدی، حیات کے لئے سامان مرگ ہے اسی لئے اللہ تع فرمایا ہے " لا تقنطوا من رحمت اللہ"

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر   از نبی تعلیم لاتحزن بگیر [۱۸]
قوت ایماں حیات افزایدت   ورد لاخوفٌ علیہم بایدت [۱۹]
بیم غیر اللہ عمل را دشمن است   کاروانِ زندگی را رہزن است [۲۰]
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست   اصلِ او بیم است اگر بینی درست [۲۱]
ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است   شرک را در خوف مضمر دیدہ است [۲۲]
خوفِ حق عنوان ایمان است و بس   خوفِ غیر از شرکِ پنہان است و بس [۲۳]

ب۔ رکن دوم رسالت :۔ جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان برسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تن مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسولؐ، مسلم کے قلب و جگر کی قوت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لئے موت کا حکم رکھتا ہے۔

سرکار مدینہ نے ہمیں دین حق اور مذہب فطرت عطا کیا اور اس لئے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہوجائے خدا نے ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کردی۔

قوّت قلب وجگر گردد نبیؐ   از خدا محبوب تر گردد نبیؐ [۲۴]
دین فطرت از نبی آموختیم   در رہ حق مشعلے افروختیم [۲۵]
لا نبی بعدی ز احسان خداست   پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است [۲۶]

رسالت محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت واخوت ومساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت واخوت ومساوات کا سبق پڑھایا۔

انما المومنون اخوۃ اندر دلش   حریت سرمایۂ آب و گلش [۲۷]
ناشکیب امتیازات آمدہ   در نہاد او مساوات آمدہ [۲۸]

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں حضرتِ حسینؓ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است   پس بنائے لا الہ گردیدہ است [۲۹]
ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست   پیش فرعونے سرش افگندہ نیست [۳۰]
رمز قرآں از حسینؓ آموختیم   ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم [۳۱]

رمز قرآن سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ چونکہ ملت محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں اس لئے:-

چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا   مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا
مسلم استی دل با قلیمے مبند   گم مشو اندر جہان چون و چند [۳۲]
دل بدست آور کہ در پہنائے دل   می شود گم ایں سرائے آب و گل [۳۳]

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دُنیا مسلمان کا

وطن ہے اور تمام زمین اس کے لئے مسجد ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است   این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است[۳۴]
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو   یعنی از قیدِ مقام آزاد شو[۳۵]
ہر کہ از قیدِ مقام آزاد شد   چوں فلک در شش جہت آباد شد[۳۶]

۵ - وطن اساس ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کیلئے ازبس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوّت کا زرّیں اصول تباہ ہوجاتا ہے۔ جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوع انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دُنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت   این شجر در گلشنِ مغرب گرفت[۳۷]
رُوح از تن رفت و ہفت اندام ماند   آدمیت گم شد و اقوام ماند[۳۸]

۶ - جس طرح ملت محمدیؐ محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقید بالزّمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ملت محمدیؐ اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خداست   اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست[۳۹]
از اجل این قوم بے پرواستے   استوار از نحن نزّلنا ستے[۴۰]
تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است   از فسردن این چراغ آسودہ است[۴۱]

۷ - نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا اور اس لئے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لئے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستور حیات اور ضابطہ عمل بنانا چاہیئے۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس   باطن دین نبیؐ این است و بس[42]
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم   حکمت او لایزال است و قدیم[43]
حرف او را ریب نے تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے[44]
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حامل او رحمۃٌ للعالمیں[45]

اس کے بعد علامہ نے مسلم سست پیماں سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں رازِ حیات بیان کر دیا ہے:۔

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو   شیوہ ہائے کافری زندانِ تو[46]
قطع کردی امرِ خود را در زبُر   جادہ پیمائی الی شیءٍ نُکر[47]
گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن[48]

۸ - انحطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں۔ بلکہ روایاتِ ملّی پر عامل ہونے کے ہیں۔ علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اگر تقلید بودے شیوہ نیک   پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے[49]

یعنی تقلید کو بُرا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے اولیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کورانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایات (CULTURAL TRADITIONS) ملّی کی حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است   معنی تقلید ضبطِ ملت است[50]

اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کر دیئے ہیں۔

نقش بر دل معنی توحید کن   چارۂ کار خود از تقلید کن[51]
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط   قوم را برہم ہمی پیچد بساط[52]
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر[53]
از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است[54]

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست　　　اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست [۵۵]

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرنا اور ریک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا۔ سُنّت نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۹) اتباع آئین الہیہ سے سیرت ملّی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالےٰ نے تراشا ہے اس میں سراسر نور اور روشنی ہے۔ اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علم حقیقت شریعت سے جدا نہیں ہے اور سُنّت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبّت کی جائے۔ ہر کہ عشق مصطفےٰ اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباع شریعت کریں۔ ملّت کا نظام اتباع شریعت پر مبنی ہے، جب یہ نظام محکم ہوجاتا ہے تو ملّت کو دوام نصیب ہوجاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" SECRET پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوّت اتباع شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے

سِرّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست　　　زیستن اندر خطر ہا زندگیست [۵۶]

آنحضرت صلعم کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات　　　شرع اُو تفسیرِ آئینِ حیات [۵۷]

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبوی سے روگردانی کی، رمزِ بقا سے محروم ہوگئے۔

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت　　　قوم را رمزِ بقا از دست رفت [۵۸]

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیئے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر　　　از خیالاتِ عجم باید حذر [۵۹]
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت　　　از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گزشت [۶۰]

قلب را زین حرفِ حق گرداں قوی   با عرب در ساز تا مسلم شوی[۶۱]

۱۰ ۔ سیرتِ قومی میں اتباعِ رسولؐ سے حُسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ مرشد رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے :۔

مگسل از ختم الرسلؐ ایامِ خویش   تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش[۶۲]

مسلمانوں کے لئے حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے ۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنما بنانا کارِ نادانی ہے ۔

غنچہ از شاخسار مصطفیٰ   گل شو از باد بہار مصطفیٰ[۶۳]
از بہارش رنگ و بو باید گرفت   بہرہ از خلق او باید گرفت[۶۴]
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم   رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم[۶۵]
از مقام او اگر دور ایستی   از میانِ معشرِ ما نیستی[۶۶]

ترجمہ اشعار فارسی

[۱] فرد ملّت ہی سے احترام حاصل کرتا ہے اور ملّت افراد ہی کی بدولت منظّم ہوتی ہے ۔

[۲] جس شخص نے ملّت کے زمزم سے پانی نہ پیا تو اس کے نغمات کے شعلے اس کے عود (ساز) میں فسردہ (مردہ) ہو کر رہ جائیں گے ۔

[۳] انسان کی فطرت آزاد بھی ہے اور مقید بھی ہے اور اس کے جزو میں کُل کو گرفت میں لانے کی قوّت پوشیدہ ہے ۔

[۴] جماعت سے وابستہ رہ کر خودی خود شکن بن جاتی ہے لیکن اس کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ وہ خودی پھول کی پتی سے ترقی کر کے چمن ہو جاتی ہے ۔

[۵] ستاروں کی محفل جذبِ باہمی پر موقوف ہے اور ایک ستارے کی ہستی دوسرے ستارے کی بدولت محکم ہے ۔

[۶] نبی کہتا ہے کہ تو کسی انسان کا بندہ نہیں ہے اور ان بتانِ بے زباں سے کمتر نہیں ہے ۔

[۷] تاکہ انہیں ایک اور صرف ایک مقصد پر متحد کر کے وہ رنی، ان کے پاؤں میں

قانون کی بیڑیاں ڈال دیتا ہے۔

۸۔ انہیں توحید کا نکتہ از سر نو سکھاتا ہے۔ نیز تسلیم و رضا کا قانون سکھاتا ہے۔

۹۔ خوف اور شک دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور عمل کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھ کائنات کی مخفی طاقتوں کو دیکھ سکتی ہے۔

۱۰۔ جب عبدہٗ کا مقام محکم ہو جاتا ہے تو (مسلمان کا) بھیک مانگنے کا پیالہ جام جمشید بن جاتا ہے۔

۱۱۔ ملتِ بیضا بمنزلہ تن ہے اور کلمۂ توحید اس کے حق میں بمنزلہ روح ہے۔ یہ توحید ہی ہمارے سازِ ہستی کے پردوں کو گردش دیتی ہے۔

۱۲۔ کلمۂ توحید ہی ہمارے تمام اسرارِ حیات کا سرمایہ ہے اور اس کا دھاگا ہی ہمارے تمام افکار کا شیرازہ ہے۔

۱۳۔ ملت کا وجود دلوں کی یک رنگی پر موقوف ہے اور یہ کوہ سینا (ملت) ایک ہی جلوے سے منور ہے۔

۱۴۔ قوم کے افراد کے دماغوں میں ایک ہی تصور ہونا چاہیئے اور اُن کے دلوں میں ایک ہی مقصود ہونا چاہیئے۔

۱۵۔ نسب پر ناز کرنا نادانی ہے کیونکہ اس کا حکم صرف جسم پر نافذ ہے اور جسم فانی ہے

۱۶۔ ہماری ملت کی بنیاد کچھ اور ہی ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔

۱۷۔ ہم حضورؐ کی تعلیم کی برکت سے بھائی بھائی بن گئے ہیں اور یک زبان، یکدل اور یک جان ہو گئے ہیں۔

۱۸۔ اے مسلمان کہ تو غم کے زندان میں قید ہے اپنے نبیؐ سے ”لاتحزن ان اللہ معنا“ کی تعلیم سیکھ۔

۱۹۔ ایمان کی قوت تیری حیات کو بڑھا سکتی ہے اس لئے تجھے ”لاخوفٌ علیہم“ کا ورد کرنا چاہیئے۔

۲۰۔ غیر اللہ کا خوف، عمل کا دشمن ہے اور زندگی کے قافلے کا رہزن ہے۔

۲۱۔ تیرے قلب میں جو بھی برائی پوشیدہ ہے اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بنیاد غیر اللہ کا خوف ہے

ص۲۲ جس نے بھی آنحضرت صلعم کی تعلیم کی رُوح کو سمجھ لیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ شرک دراصل خوف میں پوشیدہ ہے یعنی جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ دراصل مشرک ہے۔

ص۲۳ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی ایمان کا عنوان ہے اور کچھ نہیں۔ غیر اللہ کا خوف (غیر اللہ سے ڈرنا ہی شرک پنہاں ہے اور کچھ نہیں۔

ص۲۴ نبیؐ مسلمان کے قلب و جگر کی قوت بن جاتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔

ص۲۵ ہم نے دین فطرت نبیؐ سے سیکھا اور اس طرح راہِ حق میں ایک شمع روشن کر دی۔

ص۲۶ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا، دراصل خدا کا احسان ہے جو اس نے بندوں پر کیا ہے اور یہ عقیدہ پردۂ ناموس مصطفٰےؐ ہے۔

ص۲۷ مسلمان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حریت کا عقیدہ اس کی ہستی کا سرمایہ ہے۔

ص۲۸ مسلمان امتیازات کو برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ مساوات کا عقیدہ اس کی نہاد (سرشت) میں سما گیا ہے۔

ص۲۹ وہ حق کے لئے خاک اور خون میں لوٹا۔ اس طرح وہ لا الٰہ کی بنیاد بن گیا۔

ص۳۰ مسلمان ماسوی اللہ کا غلام نہیں ہو سکتا ہے اور اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھک سکتا۔

ص۳۱ ہم نے قرآن کی رمز حسینؓ سے سیکھی اس کی آگ سے بہت سے شعلے جمع کئے۔

ص۳۲ تو مسلم ہے اس لئے اپنا دل کسی خاص اقلیم سے مت لگا اور اس جہانِ چون و چند میں گم مت ہو جا۔

ص۳۳ دل کی دولت حاصل کر کیونکہ یہ جہانِ آب و گل دل کی وسعت میں گم ہو جاتا ہے۔

ص۳۴ ہجرت مسلمان کی زندگی کا قانون ہے یہ مسلمان کے ثبات کے اسباب میں سے ہے۔

ص۳۵ مچھلی کی طرح سمندر میں آباد ہو جا یعنی قید مکان سے آزاد ہو جا۔

ص۳۶ جو شخص قید مکان سے آزاد ہے وہ آسمان کی طرح کائنات میں آباد گیا۔

ص۳۷ جب سیاست نے مذہب کی مسند پر قبضہ کر لیا تو مغرب کے گلشن میں یہ شجر ویراں چڑھا۔

۳۸ نتیجہ یہ نکلا کہ جسم سے رُوح نکل گئی صرف جسم باقی رہ گیا آدمیت تو گم ہوگئی صرف اقوام باقی رہ گیئیں۔

۳۹ مسلمان قوم خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور اس کی اصل "قالوا بلی" کے ہنگامے سے ہے۔

۴۰ یہ قوم موت سے بے پرواہ ہے اور "نحن نزّلنا" سے استوار ہے۔

۴۱ چونکہ خدا نے "ان یطفئوا" فرمادیا ہے اس لئے یہ چراغ بجھ جانے سے محفوظ ہو گیا ہے۔

۴۲ مسلمان کی ہستی صرف آئین پر موقوف ہے۔ نبیؐ کے دین کا باطن صرف یہی ہے اور کچھ نہیں۔

۴۳ قرآن حکیم زندہ کتاب ہے اور اس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔

۴۴ اس کے الفاظ شک اور تغیّر سے پاک ہیں اور اس کی آیات تاویل سے بے نیاز ہیں

۴۵ یہ کتاب نوعِ انسان کے لئے پیامِ آخریں ہے اور رحمۃ للعالمینؐ اس کے حامل ہیں۔

۴۶ اے مسلمان تو رسوم میں گرفتار ہو چکا ہے اور کفر کے طریقے تیرے حق میں زنداں بن گئے ہیں۔

۴۷ تو نے "زبر" میں اپنے امر کو قطع کر دیا اور تو "الی شیٔ نکر" کے صحرا میں جادہ پیما ہو گیا

۴۸ اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں جب تک تو صرف قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائے گا۔

۴۹ اگر تقلید کرنا کوئی نیک طریقہ ہوتا تو پیغمبرؐ بھی اپنے باپ دادا کے مذہب کی تقلید کرتے۔

۵۰ اپنے بزرگوں کی راہ پر چل کیونکہ جمعیّت اسی صورت سے حاصل ہوگی۔ تقلید کا مطلب ہے ملّت کے قانون کا اتباع۔

۵۱ توحید کا مطلب اپنے دل پر نقش کرے اور تقلید سے اپنے طرزِ عمل کو درست کرے۔

۵۲ انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کرنا گویا قوم کی بساط کو لپیٹ دینا ہے۔

۵۳ عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی کرنا بہتر ہے۔

۵۴ مسلمان یک آئینی سے زندہ ہے اور ملّت کا جسم قرآن کی بدولت زندہ ہے۔

۵۵ ہم سب خاک ہیں صرف قرآن دل آگاہ ہے اسے مضبوطی سے تھام لے کیونکہ وہ "اللہ کی رسّی" ہے۔

۵۶ کیا تو جانتا ہے کہ اس فرمان کا راز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ خطروں میں زندگی بسر کرنا ہی

حقیقی زندگی ہے۔

٥٧ دین مصطفیٰ دینِ حیات ہے اور اس کی شریعت آئین حیات کی تفسیر ہے۔

٥٨ جب سے مسلمانوں نے شعار مصطفیٰ ترک کر دیا اس وقت سے قوم رمزِ بقا سے محروم ہو گئی۔

٥٩ ایک مرید نے کہا کہ اے جانِ پدر! تجھے خیالاتِ عجم سے بچنا لازم ہے۔

٦٠ (کیونکہ) اگرچہ اس کی فکر آسمانوں سے بھی اونچی ہو گئی لیکن دین نبی کی حدود سے متجاوز ہے

٦١ اپنے دل کو حرف حق (قرآن) سے مضبوط کر عرب سے موافقت پیدا کر تاکہ تو مسلمان ہو سکے۔

٦٢ اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسلؐ سے مت توڑ۔ نیز اپنے قدم پر بھروسا مت کر۔

٦٣ اے مسلمان تو مصطفیٰ کی شاخ کا ایک غنچہ ہے اس لئے مصطفیٰؐ کی بادِ بہاری سے پھول بن جا۔

٦٤ تجھے اسیؐ کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیئے اور اسیؐ کے خلق سے کچھ حصّہ حاصل کرنا چاہیئے۔

٦٥ جسکی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا اسؐ کی رحمت عام ہے اُسؐ کی اخلاق عظیم ہیں۔

٦٦ اگر تو اسؐ کے مقام سے دور ہے تو پھر ہماری جماعت میں سے نہیں ہے۔

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور
کے مقاصد کی وضاحت کے لئے مطالعہ فرمائیں!
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ
کرنے کا اصل کام تالیف ڈاکٹر اسرار احمد

علامہ اقبال مرحوم شاکی ہی رہے کہ

ع "مرا یاراں غزلخوانے شمردند!"

اب اگرچہ علامہ مرحوم کو محض ایک شاعر تو شاید کوئی بھی قرار نہ دیتا ہو تاہم یہ واقعہ ہے کہ

تاحال ہم نہ علامہ اقبال کو صحیح طور پر پہچان پائے

نہ ان کے ساتھ اپنی نسبتوں ہی کو صحیح طور پر متعین کر سکے!

اس موضوع پر **ڈاکٹر اسرار احمد** کی مختصر تالیف

علامہ اقبال اور ہم

بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر کی درخشاں مثال ہے!

(عنوانات)

● مصورِ پاکستان ● قافلۂ ملی کا حُدی خواں ● رومیٔ ثانی

● روحِ دین کی تشریح و تعبیر ● نظامِ دین کی توضیح و تفسیر

● عظمتِ قرآن کا نشان ● واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن ● داعی اِلی القرآن

(نوٹ) فارسی سے عام ناواقفیت کے پیشِ نظر علامہ مرحوم کے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بطور ضمیمہ شامل ہے!

اعلیٰ دبیز سفید کاغذ پر، آفسٹ کی حسین طباعت، خوشنما کور کے ساتھ، ۱۸×۲۲ سائز کے ۴۰ صفحات

اشاعتِ عام کی غرض سے قیمت لاگت سے بھی کم یعنی صرف ڈیڑھ روپیہ! (محصول ڈاک علاوہ)

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور — ۳۶ – کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

علامہ اقبال اور حُبِّ رسول

صلی اللہ علیہ وسلم

از قلم

محترمہ جمیلہ شوکت صاحبہ

شعبۂ معارفِ اسلامی، جامعہ پنجاب

ہدیۂ سالِ اقبال

۱۹۷۷ء

من جانب:
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
(فون: ۳۵۲۶۱۱)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

ہر دَور میں شعراء نے بھی اسلام کے فضائل و خصائص اور شارعِ اسلام نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اوصاف و محامد بیان کرنے کی طرف توجّہ مبذول کی اور حقِّ محبّت ادا کیا۔ حضرت علاّمہ اقبالؒ نے بھی حقّانیتِ اسلام، نبی کریم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی توصیف اور آپ کے عالمگیر و ابدی پیغام اور اس کے جانفزا اثرات پر اپنا قلم اٹھایا اور اپنی ذہنی و فکری قوّتوں کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وقف کر دیا۔ حضرتِ علاّمہ کے کلام بالخصوص فارسی کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ذاتِ رسالت مآبؐ سے عشق کی جو چاشنی، جذبات کی حدّت اور فراوانی ان کے یہاں ملتی ہے دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔ حضرتِ علاّمہ کے کلام میں گہرائی بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ ان کے اشعار کا ہر لفظ قاری ک دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے، جس کی توجیہ علاّمہ ہی کے کلام سے مل جاتی ہے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے　　پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے[1]!

برِّصغیر میں احیائے دین کے لیے صالحینِ امّت اور علماء کی کوششیں مسلّم لیکن بظاہر ان علماء کی مساعی کو نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مسلمانانِ برِّصغیر فرنگی تہذیب کی چمک دمک سے اتنے مرعوب ہوئے کہ اپنی پستی اور زوال کا سبب مذہب سے وابستگی کو گرداننے لگے، بالخصو نوجوان طبقہ کے دلوں میں علمائے دین کی طرف سے انقباض پیدا ہو گیا جس کی ذمّہ داری علمائ پر بھی۔ علاّمہؒ نے ان حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں کو عظمتِ گم کے حصول کی طرف مانوس طریقوں سے ہٹ کر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو مغرب زدہ نوجوان نسل کے لیے گراں نہ ہو۔ لہٰذا انہوں نے اپنی تمام توانائیاں اور قویٰ احیاءِ اسلام کے لیے وقف کر دیئے اور اُس کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا ورنہ وہ شاعری کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ فرماتے ہیں

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　بُت پرستی، بت گری مقصود نیست[2]!

۱- کلیاتِ اقبال، ۱۹۹ ۲- کلیاتِ اقبال (فارسی)، ۱۱

حضرتِ علّامہ کی شخصیّت کے متعدّد پہلو ہیں جن میں نمایاں پہلو عشقِ رسول صلّی اللّٰہ علیہ سلّم ہے۔ علّامہؒ نبی کریم صلعم کے اس حدتک شیدائی تھے کہ یہ عشق و محبّت جنون کی حدتک پہنچ گیا تھا، لیکن اس دیوانگی میں بھی فرزانگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ذاتِ رسولؐ سے عشق و محبّت میں بڑے محتاط اور مؤدّب تھے۔ وہ اس ادب کو لوازماتِ عشق میں اوّلین درجہ دیتے ہیں — فرماتے ہیں: ع ادب پہلا قرینہ ہے محبّت کے قرینوں میں۔[۳]

ذاتِ رسولؐ سے جنون کی حدتک شیفتگی و عشق کے محرّکات میں اوّلین محرّک والدین کی تربیت تھی۔ علّامہؒ کے والدین دیندار، خدا ترس اور نہایت متّقی تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند کی تربیت بھی اسلامی خطوط پہ کی۔ حضرتِ علّامہ متعدّد مقامات پر والدین کے اس احسان کا اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی نیک تربیت ہی نے عشقِ رسولؐ کا درس دیا، ایک جگہ فرماتے ہیں: ؎

پھر آرکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں کیا جنھوں نے محبّت کا رازداں مجھ کو[۴]

والدہ محترمہ کی دینداری اور خدا خوفی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات ؛ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات[۵]

اسی طرح وہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عشقِ رسول کی چنگاری میرے والد نے میرے سینہ میں روشن کی جو رفتہ رفتہ شعلۂ جوّالہ بن گئی:

از پدر تا نامِ تو آموختم آتشِ ایں آرزو افروختم![۶]

ایک جگہ فرماتے ہیں:

مرا داد ایں خرد پرور جنونے نگاہِ مادرِ پاک اندرونے![۷]

اور پھر علّامہؒ کے نزدیک نبی کریم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی ذات دنیا و مافیہا کی تمام چیزوں حتّٰی کہ والدین سے بھی زیادہ محبوب بن گئی ؎

تا مرا افتاد بر رُویت نظر از اب و اُم گشتہ محبوب تر![۸]

عشقِ رسول صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کا دوسرا اہم محرّک مغربی علوم کی تحصیل اور سفرِ یورپ ہے

۳- کُلیّاتِ اقبال (اُردو) ۱۰۵ ۴- کُلیّاتِ اقبال (اُردو) ۹۷

۵- کُلیّاتِ اقبال (اُردو) ۲۲۹ — ۶- کلیّاتِ اقبال (فارسی) ۱۶۸

۷- کلیّاتِ اقبال ۹۷۵ - ۸- کلیّاتِ اقبال (فارسی) ۱۶۶

علامہؒ نے جب عصری علوم کا مطالعہ کیا تو اسلام کے مقابلے میں دیگر ادیان اور فلسفے نظر آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی شخصیت کے سامنے بڑے بڑے انقلابی او فلاسفہ نہ ٹھہر سکے۔ وہ فلسفہ اور عصری علوم کو دردِ سر قرار دیتے ہیں اور ببانگِ دہل اعلا کرتے ہیں کہ انہیں ان علوم سے کچھ نہ ملا۔ دین و دنیا کی فلاح و کامرانی والدین کی صحب تربیت اور مرشدانِ کامل کی معیت میں حاصل ہوئی ہے۔ ؎

مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد　　کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم![۹]

اسی حقیقت کو ایک اور جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

مے از میخانۂ مغرب چشیدم　　بجانِ من کہ دردِ سر خریدم![۱۰]
نشستم با نکویانِ فرنگی　　ازاں بے سود تر روزے ندیدم

اپنی ہمشیرہ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "خدا نے مجھے قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرما تھے، اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج میں خدا کے رسول کی خد کے قابل ہو سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ جو ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے تھا اور زندگی تمام کمال نبی پاکؐ کی خدمت میں بسر ہوتی۔[۱۱] جب آپ تحصیلِ علم کے لئے یورپ گئے تو وہاں کی ماد زندگی تصورِ رسالت کو گزند نہ پہنچا سکی اور وہاں رہ کر جزئیات و فروعات میں بھی آئینِ مصطفیٰ ک اپنایا اور اس بھٹی سے کندن ہو کر نکلے، وہ خود فرماتے ہیں: "یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلما کر دیا"[۱۲]۔ سفرِ یورپ نے اُن کی نظر میں جو وسعت پیدا کی اور رسالت مآبؐ سے محبت و شیفتگی میں جو اضافہ ہوا اُس کی طرف سید مودودی اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے بھی زیادہ مسلمان پایا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں، یا وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا اور جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا[۱۳]۔

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں علامہؒ کے تاثرات رسمی و روایتی انداز س

---

[۹] کلیاتِ اقبال (فارسی) ۹۲۹ [۱۰] کلیاتِ اقبال (فارسی) ۹۲۹

[۱۱] روزگارِ فقیر: از فقیر وحید الدین ۱۹۶۵ء جلد دوم ص ۱۸۸، ۱۸۹

[۱۲] انوارِ اقبال: از بشیر احمد ڈار، ص ۱۷۶ [۱۳] اقبال کامل ص ۷۱

ا ہیں۔ علامہؒ کی زندگی کے واقعات ذاتِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبّت و بستگی کا بیّن ثبوت ہیں[14]۔ حضرتِ علامہؒ کو ہر وہ چیز عزیز اور محبوب ہے جو کسی نہ کسی طور آپ لی اللہ علیہ وسلّم) سے نسبت رکھتی ہے خواہ وہ سرزمینِ حجاز کے ذرّے ہوں ؎

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است   اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است![15]

سیرتِ مطہّرہ کے پیروکار خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”جن لوگوں کے عقائد و عمل کا خذ کتاب و سنّت ہے اقبالؔ اُن کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور اُن کی صحبت ے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزّت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے[16]۔“ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہر وقت رود بھیجنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظاہری علاج کے لاوہ باطنی علاج درود شریف کو سمجھتے تھے[17]۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کے مطابق جب اس مردِ رویش نے اپنے آپ کو سُنّتِ رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا پیروکار اور عاشق بنا لیا تو اِس ت سے دنیا کو بھی مالا مال کرنے کا عزم کیا۔ اُن کی بصیرت اور بصارت نے اس حقیقت کو یا کہ عصرِ حاضر میں مسلمانوں بالخصوص برِّصغیر کے مسلمانوں کی نکبت و ذلّت، رسوائی افتراق ور تشتت کا بڑا سبب اسلام اور شارعِ اسلام کی تعلیمات سے دُوری اور مغربی تہذیب ی اندھی تقلید ہے۔ فرنگی اقوام نے مسلمانوں میں زوال و انحطاط کے آثار دیکھ کر اُن کو اُن کے ین و مذہب سے برگشتہ و بیگانہ کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا تاکہ ”خیرِ اُمّتہ“ کی وحدتِ فاق کے شیرازہ کو پریشان کیا جاسکے۔ کیونکہ مسلمانوں کی قوّت اور اتحاد کا سرچشمہ دین سے بستگی ہی ہے، جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں: ؎

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں   جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں[18]

رتِ علامہ جو اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے، قوم کی حالتِ زار کی طرف متوجّہ ہوئے پنی تمام تر مساعی مسلمانوں کو دینِ مبین اور صراطِ مستقیم کی طرف بُلانے میں صرف کر دیں۔ بال اِس نکتہ سے آگاہ تھے کہ دینِ اسلام پر عمل پیرا ہونے کا انحصار اس امر پر ہے کہ شارعِ

---

[14] مقالاتِ اقبال: از عبدالواحد معینی ص ۷۲، ۷۴، ۴۴

[15] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص ۲۱ [16] انوارِ اقبال، ص ۱۸۶

[17] اقبال نامہ: از پروفیسر عطاء اللہ ص ۲۴۸ [18] کلیّاتِ اقبال (اردو) ص ۲۰۱

اسلام، محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اتّباع کیا جائے۔ کہ حُبِّ رسول صلعم اور اتّباعِ سنّت کے بدون اللہ سے محبّت کا دعویٰ بے بنیاد اور کھوکھلا ہے۔ علّامہؒ نے امّتِ مسلمہ کو مختلف اندا اور طریقوں سے اتّباعِ سُنّتِ رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی دعوت دی۔ وہ شدّت سے اس بات کے خواہشمند تھے کہ قوم کو بھی "صبغۃ اللہ" میں رنگ دیں اور ملّتِ اسلامیہ عشقِ رسولؐ کی آگ میں اپنے آپ کو ختم کرے ؎

حرفِ شوق آموختم، وا سوختم   آتشِ افسردہ باز افروختم![۱۹]

فلسفہ اور مذہب کا جمع ہونا اجتماعِ ضدّین ہے لیکن اس فلسفی کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ شاعری کے پردہ میں دراصل قرآن و سُنّت کی تعلیمات سے قوم کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ وہ ہر مسلمان کے لئے اتباعِ سنّتِ رسول کو لابُدی سمجھتے ہیں۔ اپنے اس مقصد کے حُصول کے لئے شاعری کی ہر صنف کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ کبھی نبی کریم کی صفاتِ حَسَنہ، اخلاقِ عالیہ اور تعلیماتِ قدسی کو موضوعِ بحث بناتے ہیں، جنھوں نے انسانیت کو تاریکیوں سے نکال کر علم و عرفان کی روشنی میں لا کھڑا کیا اور ایک اُجڈ جاہل قوم کو حکمرانی کا گُر سکھایا تو مختصر سے عرصے میں دُنیا کے ایک وسیع حصّے کی حکمران بن گئی۔ کبھی وہ دربارِ رسالتمآبؐ میں زوال پذیر ملّی و قومی حالت کا ذکر فرما کر نگاہِ التفات کے ملتجی نظر آتے ہیں تو کبھی قلبی واردات و احساسات اور جذبات کا ایک بحرِ بیکراں نظر آتا ہے اور کبھی ان تینوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اُن کے کلام میں عشقِ رسول کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے۔ وہ ہر اُس چیز سے والہانہ محبّت رکھتے ہیں جس کی نسبت خاتم الانبیاءؐ سے ہو، اسی نسبت سے وہ صحابۂ کرامؓ اولیاء و صالحین اور علماء کی تقلید کا حکم دیتے ہیں، کیونکہ یہ سب دنیاوی اغراض سے پاک صاف تھے! ؎

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات   ملّت از تقلید می گیرد ثبات!
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست   کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست[۲۰]

اُمّتِ مُسلمہ کے ساتھ قلبی لگاؤ کا محرّک بھی یہی ہے کہ یہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبوب ملّت ہے ؎

زانکہ تو محبوبِ یارِؐ ماستی   ہمچو دل اندر کنارِ ماستی

---

[۱۹] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۸۸۲ [۲۰] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۲۴، ۱۲۵-

بعثتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے وہ دنیا کی حالت بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ساری دُنیا شرک، اوہام پرستی، ستارہ پرستی، قومی، نسلی اور لسانی تعصب میں گرفتار تھی۔ آپ صلعم نے بنی آدم کو ان تمام برائیوں اور نجاستوں سے پاک کیا اور ان کو ایسا دستورالعمل عطا کیا جس نے انہیں زندگی کے ہر شعبہ اور میدان میں عقل و خرد سے کام لینا سکھا دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ نہایت مختصر عرصے میں اس نبی پاکؐ کی اُمّت میں وہ عظیم انقلاب رُونما ہوا کہ بڑے بڑے طاقتور اور جابر حکمرانوں نے ان کی سیادت کو تسلیم کیا۔ علّامہ فرماتے ہیں کہ اللّٰہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق اپنی اُس محبوب ہستی کی خاطر ہی کی جسے رحمۃ للعالمین اور خاتم الانبیاءؑ جیسے عظیم القابات سے نوازا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ کائنات کی تمام رعنایاں اُسی کے دم سے ہیں، تو بے جا نہ ہوگا، فرماتے ہیں ؎

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی　　جلوہ ات تعبیرِ خوابِ[۲۲] زندگی!
اے زمیں از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسۂ بامت بلند!

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ　　ذرّۂ ریگ کو کر دیا تو نے طلوعِ آفتاب[۲۳]

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنّم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو!
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو!
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے　　نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے[۲۴]

آپ صلعم کی صفاتِ عالیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا کو اعلیٰ ترین آئین آپؐ ہی نے عطا فرمایا اور زندگی کی شمع آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی نے روشن فرمائی :؎

در جہاں آئینِ نَو آغاز کرد　　مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد!
از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد　　ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی[۲۵] نہ زاد!
در جہاں شمعِ حیات افروختی　　بندگاں را خواجگی آموختی![۲۶]

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت و شفقت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کی ذات نہ صرف دوستوں بلکہ دشمنوں کے لئے بھی سراپا رحمت و شفقت تھی :۔

---

[۲۲] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۲۶ ۔ [۲۳] کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۲۰۵
[۲۴] کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۲۰ ۔ [۲۵] کلیاتِ اقبال (فارسی) [۲۶] کلیاتِ اقبال (فارسی)

لطف و قہر او سراپا رحمتے   آں بیاراں ایں باعدا رحمتے ![27]

نبی کریمؐ کے دیگر احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس عالم کو نئی زندگی آپ ہی کے دم سے نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کو توحید کی نعمت سے سرفراز فرما کر غیر اللہ کی پرستش سے آزاد کر دیا۔ علم و عرفان اور حکمت کی شمع آپ ہی نے روشن کی، آپ ہی نے مسلمانوں کو متحد اور ایک مرکز پر جمع کیا : ؎

سوختی لات و منات کہنہ را   تازہ کردی کائنات کہنہ را!
نے خداہا ساختیم از گاو خر   نے حضورِ کاہناں افگندہ سر[28]
علم و حکمت ریزہ از خوانِ کیست؟   آیۂ فاصبحتم اندر شانِ کیست؟[29]

حریت و مساوات کا درس بھی آپؐ ہی نے مسلمانوں کو دیا۔ یہ آپ ہی کی تعلیمات کا کرشمہ ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے تن تنہا فرنگی طاقت کا مقابلہ کیا۔ برگزیدہ ہستیوں کے کارناموں کی پشت پر آپؐ کی عالمگیر تعلیمات ہی کارفرما نظر آتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ عظیم مسلمانوں کی تمام خوبیاں اور کارنامے آپؐ کی شخصیت مبارکہ کا ادنیٰ سایہ تو اور آپ کی تجلیات میں سے صرف ایک تجلی ہے تو بے جا نہ ہوگا اور یہ تو وہ کمالات ہیں جو ظاہر و باہر ہیں اور ہم ظاہر بینوں کو نظر آتے ہیں، رہے باطنی کمالات تو وہ عارفوں سے بھی پوشیدہ ہیں : ؎

ایں ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست   یک تجلی از تجلیاتِ اوست[30]

علامہؒ فرماتے ہیں کہ وہ ہستی بے پایاں حمد و سپاس کے لائق ہے جس نے توحید اور دولتِ ایمان سے بنی آدم کو مالا مال کیا :

حمد بے حد مر رسولِ پاکؐ را   آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را![31]

حضرت علامہ اسی احسان کی وجہ سے ذات رسالت مآبؐ سے زیادہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں ؎

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ !   از خدا محبوب تر گردد نبیؐ ![32]
بچشمِ من نگاہ آوردۂ تست   فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست ![33]

---

[27] کلیات اقبال (فارسی)، ص۱۶۶ [28] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۸۴۴
[29] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۸۳۵ ـ [30] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۸۳۶
[31] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۸۲۶ ـ [32-33] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۰، ۹۳۲

اپنی اس والہانہ محبّت کا اظہار ایک موقعہ پر یوں فرماتے ہیں کہ میں پہلے مکّہ مکرّمہ میں آپؐ کے حکم کی تعمیل میں آیا ہوں ورنہ میری منزلِ مقصود آپؐ کا شہر تھا :

تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم   وگرنہ جُز تو ما را منزلے نیست [۳۴]

علّامہؒ خدا کی بارگاہ میں کسی قدر شوخ لیکن دربارِ رسالت مآبؐ میں بڑے مؤدّب اور خود رفتہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس وارفتگی میں بھی ہوش کا دامن نہیں چھوٹتا، وہ فرماتے ہیں کہ ایک آپؐ ہی کی ذات ہے جس سے حالِ دل بلاواسطہ عرض کیا جا سکتا ہے :

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار   یا رسول اللہ او پنہان و تو پیدائے من [۳۵]

پھر فرماتے ہیں کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت ہی میری دین و دنیا کی سرفرازی کے لئے کافی ہے یہی میری ابتدا اور یہی میری انتہا ہے :

[۳۶]
بجوئے تو گدازِ یک نوا بس   مرا ایں ابتدا، ایں انتہا بس!
خرابِ جرأتِ آں رندِ پاکم   خدا را گفت ما را مصطفٰےؐ بس

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر   وہی قرآں، وہی فرقاں [۳۷]، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

علّامہؒ کو ملّتِ اسلامیہ سے محبّت ہے، اُس کی پستی اور زوال پر وہ دردمند ہیں۔ اِس پستی اور زوال کا اہم سبب ترکِ سُنّتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ وہ مسلمانوں کو مختلف اندازاور طریقوں سے اس چشمۂ صافی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، تاکہ اُن کی ذلّت و نکبت، عزّت و عظمت میں بدل جائے۔ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی فوز و فلاح کا مدار عشقِ رسولؐ پر ہے۔ ملّت کا وجود رسولِ اکرمؐ کے دم ہی سے وابستہ ہے :

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید   وز رسالت در تنِ ما جاں دمید! [۳۸]

نیز رسالت ہمارے وجود کی حفاظت کے لئے بطور حصار ہے ؏

از رسالت حلقہ گردِ ما کشید [۳۹]

اور اگر یہ کہا جائے کہ ملّتِ اسلامیہ کے وجود کے لئے سنّت کی حیثیّت شہ رگ کی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا :

قلبِ مومن را کتابش قوّت است   حکمتش حبل الورید ملّت است

---

[۳۴] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۹۲۸۔ [۳۵] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۲۵۳۔
[۳۶] کلیاتِ اقبال ص۹۴۱۔ [۳۷] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۳۱۷
[۳۸] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۰۱۔ [۳۹] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۰۱۔

وہ مسلمانوں کو تاکید فرماتے ہیں کہ تمہاری وحدت کا راز دینِ فطرت کی پیروی پر منحصر ہے جس کی طرف نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے رہنمائی فرمائی : ؎

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است   وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم   در رہِ حق مشعلے افروختیم[۱۴۱]
از رسالت ہم نوا گشتیم ما   ہم نفس، ہم مدّعا گشتیم ما[۱۴۲]

مسلمان جنھوں نے فرنگی اطوار و عادات کی تقلید کو اپنا مقصود بنا لیا تھا، مختلف انداز سے انہیں آمادۂ عمل کرتے ہیں تاکہ وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح عظمت و رفعت حاصل کر سکیں ؎

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا   رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرّے سے بیاباں ہو جا   نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے   [۱۴۳]دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا کی رزم گاہ میں عشقِ رسول ہی تیری شمشیر ہے

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری   مرے [۱۴۴]درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

وہ دربارِ رسالت مآب میں اُمّت کی زبوں حالی کا قصّہ سناتے ہیں کہ آج کا مسلمان آپؐ کی تعلیمات سے بیگانہ ہو گیا ہے سو آپ ملّتِ اسلامیہ پر نظرِ کرم فرمائیں کہ ان کا شیرازہ بکھر گیا ہے ؎

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر   اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ فرماتے ہیں کہ آج مسلمان حقیقی معبود کو چھوڑ کر کسی نہ کسی بت کی پرستش میں مصروف ہے اور اس کا دل آپ کی محبت سے خالی ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں پیروانِ بولہب کی فراوانی ہے۔ ؎

سازِ ما بے صوت گردید آنچناں   زخمہ بر رگہائے او آید گراں!
در عجم گردیدم و ہم در عرب   مصطفیؐ نایاب و ارزاں بولہب[۱۴۵]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں : [۱۴۶]مسلم از سرِّ نبیؐ بیگانہ شد : باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد

---

[۱۴۱] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۱۰۲، [۱۴۲] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۲۰ ؛
[۱۴۳] کلیاتِ اقبال (اُردو) ص۲۰، [۱۴۴] کلیاتِ اقبال (اردو) ص۸۴۴ -
[۱۴۵] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۸۴۴ ، ص۸۴۵ - [۱۴۶] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۸۲

عصرِ ما، ما را ز ما بیگانہ کرد   از جمالِ مصطفیٰ بیگانہ کرد![47]

ان حالات میں علامہؒ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف رجوع فرماتے ہیں اور دربارِ رسالت میں عرض کرتے ہیں کہ اے حضور! (صلّی اللہ علیہ وسلّم) میں نے اِس مردہ دل مسلمان کی حیاتِ نَو کے لئے آپؐ کی طرف رجوع کیا ہے کہ اس کے درد کا مداوا آپ کے سوا کسی کے پاس نہیں ؎

نعشش از پیشِ طبیباں بُردہ ام   در حضورِ مصطفیٰ آوردہ ام![48]

آج کا مسلمان کافر کی طرح موت سے خوفزدہ ہے کہ اُس کا سینہ دل سے عاری ہوچکا ہے آپؐ سے استدعا ہے کہ اُمّت کے حال کی طرف نگاہِ التفات فرمائیں اور ان کے دل سے موت کا خوف نکال دیں اور ان کے دلوں کو اپنی محبّت سے معمور فرمادیں تاکہ اُمّت پر پڑی اُفتاد کا ازالہ ہوسکے : ؎

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ   سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ[49]
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد   جہاں گردیدم و او را ندیدم![50]
دلے در سینۂ چاکش ندیدم!   دمِ بگسستہ بود و غمِ مرگ!
اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ   وا رہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ[51]
مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے!   رمید از سینۂ او سوزِ آہے!!
دلش نالد؟ چرا نالد؟ نہ داند   نگاہے یا رسول اللہ! نگاہے![52]

پھر فرماتے ہیں کہ اگر آپؐ توجّہ نہیں فرمائیں گے تو مجھے خدشہ ہے کہ ملّی ہستی کا خاتمہ ہوجائے گا ؎

ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک   باندیش از چراغِ بسملِ اُو[53]

وہ کسی وقت اُمّتِ مسلمہ کو اسلاف کے کارنامے سنا کر ان کو حیاتِ تازہ بخشتے اور اُن کو مذہب کی طرف مائل کرتے ہیں : ؎

باز خوانم قصّۂ پارینہ ات   تازہ سازم داغہائے سینہ ات[54]

---

[47] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۸۲، [48] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۶۷

[49] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۶۷، [50] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۹۲۲

[51] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۹۱، [52] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۸۴۴

[53] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۹۱۶، [54] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۸۳

—— کہیں بلاواسطہ قوم کو آنحضورؐ کی طرف رجوع کرنے کا درس دیتے ہیں ؎

تاکجا بے غیرتِ دیں زیستن　　اے مسلماں! مردن است ایں زیستن
بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند　　تا جہانے دیگرے پیدا کند[۵۵]

وہ قوم کو اپنے آپ کو پہچاننے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ جمالِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہو سکے۔ قوم کے سامنے اس حقیقت کو بار بار رکھتے ہیں کہ شریعت کا منبع آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے لہٰذا جب تک صاحبِؐ شریعت کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا، شریعت پر عمل ناممکن ہے : ؎

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات　　روشن از نورش ظلامِ کائنات
حکمتش از عدل است و رضاست　　بیخِ او اندر ضمیرِ مصطفیٰؐ است[۵۶]

حضورؐ ساری کائنات کے عشق کا منبع و مرکز ہیں، حتیٰ کہ جبریلِ امینؑ کا وجود بھی سرکارِ دو عالم کے وجود پر منحصر ہے : ؎

جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل　　کہ او یک جوہر از آئینۂ تست![۵۷]

بعض وقت وہ بڑے رجائی انداز میں اُمّت کو سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں ؎

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کرلو　　ملّتِ احمدِؐ مُرسل کو مقامی کرلو![۵۸]

وہ دُونِ اللہ سے اعراض کا سبق بھی دیتے نظر آتے ہیں ؎

از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو　　فارغ از اربابِ دُون اللہ شو![۵۹]

وہ اپنے ہم وطنوں کو اس نکتہ سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروانوں کو خوب سے خوب تر بناتا ہے اور دل کو توانائی نصیب ہوتی ہے : ؎

عاشقانِ اُو ز خُوباں خوُب تر　　خوشتر و زیباتر و محبوب تر![۶۰]

اگر اے مسلمان! تُو آج عزّت وسیادت کا خواہش مند ہے تو حضورؐ کا دامن تھام لے :

قطرۂ نیساں کہ مہجور از یم است　　نذرِ خاشاکے مثالِ شبنم است

---

[۵۵] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۸۱۹ [۵۶]، کلیاتِ اقبال ص۸۲۶، ص۸۲۷
[۵۷] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۹۳۶، [۵۸] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۱۰۲
[۵۹] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۶۱، [۶۰] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۹ ؛

اگر تو آفتاب سے بھی زیادہ تابندہ اور منوّر بننا چاہتا ہے تو حضورؐ کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے جو انسان کے اندر ما فوق الفطرت قوّت و طاقت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے :ـــ

درجہاں روشن تر از خورشید شو   صاحبِ تابانیٔ جاوید شو![۶۲]

حضرتِ علاّمہ بارگاہِ رسالت میں اُمّت کا مقدّمہ پیش کرتے ہیں تو بعض اوقات سرِ ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جس قوم کے اعمال و افعال محض فرنگیوں کا چربہ ہیں، امتِ رسوؐل ہونے کا دعویٰ اور نگاہِ التفات کی التجا کس منہ سے ہو :ـــ

چوں بنامِ مصطفےٰ خوانم درود   از خجالت آب می گردد وجود[۶۳]
جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم   چو گبراں در حضورِ او سرودیم![۶۴]

وہ دربارِ رسالت میں اپنی قوم کی شکایت بھی کرتے ہیں کہ اے میرے آقا! میں نے اپنی قوم کو پیغامِ حق سنایا اور آپ کی محبت کا درس دیا لیکن قوم نے میرے اس جانفزا پیغام کی طرف توجّہ نہ دی اور طرح طرح کے الزامات تراشے، سو اگر مَیں نے حق بات کہی ہے تو عرض ہے کہ مجھے اس کا صلہ عطا فرمائیں :ـــ

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام   با مسلماناں اگر حق گُفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است   یک دُعایت مُزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل   عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل!
دولتِ جانِ حزیں بخشندۂ   بہرۂ از علمِ دیں بخشندۂ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا   آبِ نیسانم گہر گرداں مرا![۶۵]

اور اگر میری دعوت میں تصنّع اور ریا ہے تو اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجئے :ـــ

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[۶۶]

اندھیرے میں بھٹکنے والی قوم کی راہبری کیلئے ہی حضرتِ علاّمہ کی زبان پر یہ نغمہ جاری

---

[۶۲] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۳۳ [۶۳] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۸۳۳
[۶۴] کلیّاتِ اقبال (فارسی)، ص۹۲۱ [۶۵] کلیّاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۶۸ ؏
[۶۶] کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص۱۶۸ ۔

ہوا۔! ؎

مجھے عشق کے پَر لگا کر اڑا   میری خاک جگنو بنا کر اڑا[۶۷]

اس سوز و تاب کے باوجود ھَلْ مِنْ مّزید کا جذبہ موجزن نظر آتا ہے: ؎

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے   دلِ مرتضےٰؓ سوزِ صدّیقؓ دے[۶۸]

ذاتِ رسالت مآبؐ سے عشق و محبّت کے اس وفور اور خواہش کے باوجود آغاز میں روضۂ اقدس پر اپنے آپؐ کو حاضری کے قابل نہیں سمجھتے تھے لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ جب اس مردِ قلندر کی نظروں میں آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیکر سما گیا تو حاضری کی خواہش شدّت اختیار کر گئی، جیسا کہ "اقبال کامل" کے مصنّف کہتے ہیں: "حج کی ادائیگی کا خیال آخر عمر میں پیدا ہوا اور دن بدن بڑھتا گیا۔ جب ۱۹۳۲ء میں مؤتمرِ اسلامی میں شرکت کے لئے دمشق پہنچے تو سفرِ حج کا سامان مکمّل تھا لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ دربارِ حبیبؐ میں ضمناً حاضری دی جائے اس لئے اس وقت شوق پورا نہ ہو سکا[۶۹]۔ جب کسی عزیز یا دوست کے حج پر جانے کی خبر سنتے تو آپ کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی۔ وہ دربارِ رسالت سے دُوری کو اپنی کم نصیبی پر محمول کرتے اور روضۂ اقدس کے دیدار کو نگاہوں کی روشنی کا باعث سمجھتے: ؎

حیف او محرومِ دربارِ نبیؐ   چشمِ من روشن ز دیدارِ نبیؐ![۷۰]

اپنے قلبی تأثّرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روضۂ اقدس سے یہ دُوری مجھے ہر آن بےکل و بےچین رکھتی ہے: ؎

جاں ز مہجوری بنالد در بدن   نالۂ من، وائے من! اے وائے من![۷۱]

وفات سے پہلے جب بیمار ہوئے تو اس وقت بھی آپؐ کی زبان پر یہ کلمات ہوتے تھے کہ اگر طاقت و قوّت والے اللہ نے مجھے صحت عطا فرما دی تو پہلا کام یہی کروں گا کہ حجّ کو جاؤں گا۔ لیکن علّامہ محترم جذبۂ صادق اور ذوق و شوق رکھنے کے باوجود مادّی اور حسّی طور پر مدینہ کا سفر نہ کر سکے اور حجِّ بیت اللہ ادا نہ کر سکے: "وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ"! لیکن ذہنی اور قلبی طور پر وہ اس ذاتِ مبارک صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اس قدر وابستہ رہے کہ چشمِ تصوّر میں

---

[۶۷] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۴۱۶، [۶۸] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۴۱۶ ؛
[۶۹] اقبالِ کامل ص۷۲، [۷۰] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۸۴۸ ؛
[۷۱] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۸۴۸،

کئی بار اس مقدّس سفر کو اختیار کرتے ہیں اور ہر لحظہ ان کا دل اسی مقام سے اٹکا رہتا ہے:

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم   زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم![۷۲]

سفر کے دوران تمام مراحل اور وارداتِ قلبی کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ گویا حقیقتاً وہ اس مبارک سفر میں ہیں۔ انہیں اس سفر کا سوز دل کو لبھاتا ہے اور محبوبؐ سے غمِ جدائی سے ایک خاص قسم کی لذّت محسوس کرتے ہیں اور ساربان سے مخاطب ہوتے ہیں کہ مجھے دربارِ نبویؐ میں کسی طویل تر راستہ سے لے چل جو جدائی کے سوز میں مزید حدّت اور تیزی پیدا کر دے: ؎

بگیر اے ساربان راہِ درازے!   مرا سوزِ جدائی تیز تر کن![۷۳]

شدّتِ جذبات سے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور ہم سفر سے مخاطب ہوتے ہیں کہ آؤ دربارِ رسالت مآبؐ میں جا کر دردِ دل بیان کریں اور اُس محبوبؐ کے قدموں میں اپنی آنکھیں بچھائیں ؎

دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم   بپائے خواجہ چشماں را بمالیم[۷۴]

آخر میں حضرتِ علامہؒ کی آہ و فغاں رنگ لاتی ہے اور سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دربار میں رسائی ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسرارِ حیات کو بے نقاب کیا جاتا ہے اور جہاں ہر شخص کو رسائی ہے اور جس کا فیض ہر امیر و غریب کے لئے عام ہے اور جس کے دربار سے کوئی بے نیلِ مرام نہیں واپس ہوتا ؎

دریں وادی زمانی جاودانی   ز خاکش بے صُوَر روید معانی![۷۵]
حکیماں با کلیماں دوش بر دوش   کہ ایں جا کس نگوید 'لن ترانی'

”رموزِ بیخودی“ میں دل کی دیرینہ تمنّا اور آرزو کو بیان کرتے ہیں کہ اے احمدِ مجتبیٰ حبیبِ کبریا صلّی اللہ علیہ وسلّم! مدّت سے ایک آرزو میرے سینہ میں پرورش پا رہی ہے لیکن آج تک میں اس کے اظہار کی جرأت نہ کر سکا لیکن آپ کی شفقت و رحمت نے آج مجھے یہ حوصلہ عطا کیا ہے کہ اس کو زبان پر لاؤں!

ایں تمنّا در دلم خوابیدہ ماند   در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
شرم از اظہارِ او آید مرا   شفقتِ تو جرأت افزاید مرا![۷۶]

---

[۷۲] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۱۶۳، [۷۳] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۹۱۱ ؛
[۷۴] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۹۱۱، [۷۵] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۹۱۲ ؛
[۷۶] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۱۶۹، ص۱۷ ؛

اور وہ آرزو یہ ہے کہ مجھے اپنے محبوب کے قدموں میں موت آئے مجھے اپنے پاس بلانے کا سا
کیجئے اور میں اس کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں رکھتا:-

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز   آرزو دارم کہ میرم در حجاز![77]

ایک اور جگہ اپنی اس خواہش کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں :- ؎

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی   مَیں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں![78]

علاّمہ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ مرنے کے بعد کُفرستان میں مدفون ہوں لہٰذا اُن کی دلی خواہش تھی کہ مدینہ منوّرہ کی مٹی میں اُن کی مٹی مل جائے۔ نیز حضرتِ علاّمہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے درخواست کرتے ہیں کہ مجھے ایسا خوش نصیب بنا دیجئے کہ میری قبر آپؐ کی دیوار کے سائے میں بنے تاکہ میرے دلِ بیقرار کو سکون و قرار حاصل ہو اور دنیا والوں سے یہ کہہ سکوں:

با فلک گویم کہ آرامم نگر[79]   دیدۂ آغازم، انجامم نگر

اگرچہ اس مردِ مجاہد کی یہ خواہش پُوری نہ ہوئی، لیکن یہ حضورؐ کی نگاہِ کرم کا صدقہ ہے کہ مرحوم کو "بادشاہی مسجد" کی دیوار کے سائے میں جگہ ملی۔ لوگ آج بھی روحانی فیض کے حصُول کے لیے اُن کی قبر کا رخ کرتے ہیں اور نہال ہو کر واپس لوٹتے ہیں : ؎

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا   دی تھی دُعا کسی نے کہ جنّت میں گھر ملے![80]

مسلمانانِ پاکستان "سالِ اقبال" منا کر اُن کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں لیکن حقیقی ہدیہ جو اُن کی شان کے شایان ہے صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف ان کی تعلیمات اور پیغام کو عام کریں بلکہ اپنے اندر عشقِ رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا وہی رنگ پیدا کریں جس میں وہ رنگے ہوئے تھے اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے درمیان قابلِ صد احترام والتکریم ہیں۔

---

[77] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۱۰۷، [78] کلیّاتِ اقبال (اُردو) ص۱۹۸ ؛
[79] کلیّاتِ اقبال (فارسی) ص۱۷۰، [80] دیوان مفتی صدرالدّین آزردہ

عدلِ اجتماعی
اور
قرآنِ حکیم

ایک مقالہ جو ۲۶ - نومبر ۷۷ء کی شام کو
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور
کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی
چوتھی سالانہ قرآن کانفرنس
میں پیش کیا گیا

از

مولانا محمد طاسین

مجلس علمی، کراچی - ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

عدلِ اجتماعی اور قرآنِ حکیم

عدل اجتماعی سے مراد وہ معتدل اور متوازن اجتماعی حالت ہے جو معاشرے کے سب افراد کے ہمہ قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہو جانے سے ظہور میں آتی ہے۔ لہٰذا عدلِ اجتماعی کے ظہور میں آنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے: ایک یہ کہ معاشرے کے سو فیصد افراد کے حقوق محفوظ ہوں، دوسری یہ کہ ہر فرد کے ہر قسم کے حقوق محفوظ ہوں، اور تیسری چیز یہ کہ وہ حقوق ٹھیک ٹھیک اور پورے پورے محفوظ ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر کسی معاشرے میں بعض افراد کے حقوق محفوظ ہوں اور دوسرے بعض کے محفوظ نہ ہوں، یا یہ کہ بعض قسم کے حقوق محفوظ ہوں اور بعض قسم کے محفوظ نہ ہوں یا یہ کہ وہ حقوق ٹھیک ٹھیک اور پورے محفوظ نہ ہوں بلکہ ناقص اور ادھورے محفوظ ہوں تو ان تینوں صورتوں میں معاشرے کی جو اجتماعی حالت ہوتی ہے وہ عدلِ اجتماعی کا مصداق نہیں۔

عدلِ اجتماعی کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس معاشرے میں پایا جاتا ہے وہاں پائیدار امن و اطمینان کی خوشگوار فضا وجود میں آتی اور ہر فرد کو اپنی طبعی عمر تک اطمینان و مسرت کے ساتھ زندہ رہنے کا موقعہ ملتا اور اس کی وہ فطری اور خلافتی صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آتی ہیں جو تسخیر و تعمیرِ کائنات کی غرض سے اسے ودلیعت کی گئی ہوتی ہیں۔

اِدھر چونکہ ہر انسان کے اندر پیدائشی اور طبعی طور پر یہ طلب و خواہش پائی جاتی ہے کہ اُسے اس دنیا میں بھی پائیدار امن و اطمینان کی خوشگوار زندگی نصیب ہو اور وہ اپنی طبعی عمر تک سکون و مسرت کے ساتھ زندہ رہے اور ارتقاء کے اس بلند درجہ تک پہنچے جو اس کے لیے ممکن ہو سکتا ہے، اور اس کی یہ طلب و خواہش چونکہ عدلِ اجتماعی کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی لہٰذا عدلِ اجتماعی کی اہمیت اور ضرورت کا احساس دُنیائے انسانیت میں ہمیشہ موجود رہا اور ہر انسانی معاشرے نے اُسے ایک اعلیٰ مقصد قرار دے کر عمل میں لانے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ آج بھی دنیا میں جتنے سماج اور معاشرے ہیں وہ دینی و مذہبی قسم کے ہوں یا لادی

اور سیکولر ٹائپ کے، وہ متمدّن اور ترقّی یافتہ قسم کے ہوں یا غیر متمدّن اور پس ماندہ، ہر ایک کے ہاں عدلِ اجتماعی کی اہمیّت اور ضرورت کا احساس موجود ہے اور سب اپنے اپنے طریقہ سے اسے عمل میں لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ دراصل جہاں بھی قانون اور حکومت کے ادارے موجود ہیں وہ اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ وہاں عدلِ اجتماعی کی اہمیّت اور ضرورت کا احساس موجود ہے کیونکہ قانون اور حکومت کے وجود کا اصل مقصد سب کے حقوق کا تحفّظ کرنا اور عدل و انصاف کا قیام ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ دراصل عدلِ اجتماعی کی اہمیّت اور ضرورت کے احساس سے دنیا میں قانون اور حکومت کی اہمیّت اور ضرورت کا احساس پیدا ہوا مطلب یہ کہ اگر دنیائے انسانیت میں عدلِ اجتماعی کی ضرورت کا احساس نہ ہوتا یا یہ ضرورت قانون اور حکومت کے بغیر کسی دوسرے ذریعہ سے پوری ہو سکتی ہوتی تو قانون اور حکومت کے ادارے وجود میں نہ آتے جو پابندی اور خوف کی علامت ہیں جسے انسان طبعاً پسند نہیں کرتا اور بُرا سمجھتا ہے کیونکہ اِس سے اُس کی آزادی متاثر ہوتی ہے۔

ہر انسانی معاشرے میں عدلِ اجتماعی کی اہمیّت اور ضرورت کا احساس پائے جانے کا اس سے بھی پتہ چلتا اور اظہار ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ہاں تعلیم و تربیت کا جو نظام ہے اُس میں عدلِ اجتماعی کی طرف خاص توجّہ ہے۔ افراد کے اندر حقوق و فرائض کا شعور اور ذمّہ داریوں کا احساس بیدار کرنے کا مقصد اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ معاشرے میں عدلِ اجتماعی قائم ہو اور سب کو امن و اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع ملے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ دنیا کے ہر انسانی معاشرے میں عدلِ اجتماعی کی ضرورت کا احساس جس طرح ماضی میں موجود رہا اسی طرح حال میں بھی موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج بدقسمتی سے وہ کہیں بھی اپنی جامع اور وسیع شکل میں نظر نہیں آتا جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط اور حاوی ہو بلکہ ناقص شکلوں میں نظر آتا ہے کہیں وہ محض معاشی پہلو تک محدود اور کہیں صرف معاشرتی پہلو تک محدود ہے، کہیں وہ محض سیاسی پہلو تک محدود اور کہیں دینی و مذہبی پہلو تک محدود ہے اس کا نتیجہ یہ کہ کہیں بھی وہ پائیدار امن و اطمینان موجود نہیں جو صرف عدلِ اجتماعی کی جامع اور کامل شکل سے ہی وجود میں آ سکتا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک عارضی، وقتی اور محدود امن و اطمینان کا تعلق ہے وہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ معاشروں میں بھی بعض افراد کو حاصل ہو جاتا ہے لیکن ایک مستقل، مسلسل اور

غیر محدود امن و اطمینان، کسی فرد کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ معاشرے میں کامل عدل و انصاف موجود نہ ہو، اور چونکہ انسان عارضی، وقتی اور محدود نہیں بلکہ مستقل دائمی اور غیر محدود امن و اطمینان چاہتا ہے لہٰذا عدل اجتماعی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ اور چونکہ میرے اس مقالے کا موضوع " عدلِ اجتماعی اور قرآن حکیم " ہے لہٰذا مجھے اس مقالہ میں موضوع کے تین پہلوؤں کو واضح کرنا ہے۔ اوّل یہ کہ عدلِ اجتماعی کی قرآن حکیم کے نزدیک کیا اہمیّت ہے ؟ دوم یہ کہ عدلِ اجتماعی کے لیے قرآنِ حکیم فکر و عمل کا جو ضابطہ اور جو نظامِ ہدایت پیش کرتا ہے وہ کیا ہے ؟ سوم یہ کہ عدلِ اجتماعی کو بروئے کار لانے کے لیے قرآنِ حکیم جو طریقِ کار تجویز کرتا ہے، وہ کیا ہے ؟

پہلے سوال کا جواب یہ کہ قرآن حکیم عدلِ اجتماعی کو بنیادی اور مرکزی اہمیّت دیتا حتیٰ کہ اسے اپنے نزول کی علّت اور غرض و غایت بتلاتا ہے۔ اس کا ثبوت قرآن حکیم کی اُس آیتِ مبارکہ سے فراہم ہوتا ہے جو سورۃ الحدید میں بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ : وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (اور بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کے سہارے کھڑے ہو جائیں۔) یہ آیت صاف بتلاتی ہے کہ اللہ نے انسانی ہدایت و راہنمائی کے لیے جتنے رسول بھیجے اور جتنی کتابیں نازل فرمائیں اُن سب سے مقصد یہ تھا کہ ایک انسانی معاشرہ وجود میں آئے جو قسط و عدل پر قائم ہو، بالفاظِ دیگر اس سے ایک بڑا مقصود یہ تھا کہ معاشرۂ انسانی میں عدلِ اجتماعی قائم ہو۔

مفسّرینِ کرام نے لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ کی تفسیر میں قِسط کے معنی عدل لکھے ہیں : علّامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے : بِالْعَدْلِ فی معاملاتهم۔ علّامہ ابنِ کثیر نے لکھا ہے : بالحق والعدل، علّامہ طبری نے لکھا ہے : لیعمل الناس بینهم بالعدل، سراج المنیر وغیرہ میں لکھا ہے : لیتعاملوا بینهم بِالْعدل، امام فخر الدّین رازی نے لکھا ہے : القسط والاقساط هو الانصاف وهو ان تعطی قسط غیرك كما تأخذ قسط نفسك ____ تفسیر بحر المحیط میں لکھا ہے : القسط هو العدل فی جمیع الاشیاء، تفسیر رُوح المعانی میں علّامہ آلوسی نے لکھا ہے : والقیام بالقسط ای بالعدل یشمل التسویة فی امور التعامل۔ مفردات امام راغب، لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ مستند کتبِ لغت

میں بھی قِسط کے معنی عدل و انصاف لکھے ہیں لیکن انہی کتابوں میں عدل اور قِسط کی جو پوری تشریح و تفصیل ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قِسط میں بہ نسبت عدل کے زیادہ عموم اور اُس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قِسط کا استعمال معنوی اور حِسّی دونوں قسم کی چیزوں میں ہوتا ہے جبکہ عَدل کا استعمال صرف معنوی چیزوں پر ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے عَدل اور عِدل کے مابین جو فرق لکھا ہے وہ یہ کہ عَدل کا استعمال اُن چیزوں میں ہوتا ہے جن کا ادراک بصیرت و عقل سے کیا جاتا ہے جیسے احکام، اور عِدل کا استعمال اُن چیزوں میں ہوتا ہے جن کا ادراک حواسِ ظاہری سے کیا جاتا ہے جیسے معدودات، موزونات اور مکیلات وغیرہ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف لفظِ عَدل اور صرف لفظِ عِدل سے وہ پورا مفہوم و مطلب ادا نہیں ہوتا جو تنہا لفظِ قِسط سے ادا ہوتا ہے۔ البتّہ لفظِ عَدل اور عِدل دونوں کے مجموعے سے لفظِ قِسط کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ بنا بریں عَدل کے مقابلہ میں قِسط زیادہ جامع ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیت میں لفظِ عدل کی بجائے لفظِ قسط اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں جو مطلب بیان کرنا مقصود تھا وہ یہ کہ لوگ ہر قسم کے اُمور میں خواہ معنوی ہوں یا حِسّی، عقل سے سمجھے جاتے ہوں یا حواس سے، انصاف کریں اور ایک دوسرے کو اس کا حصّہ پُورا پُورا دیں اور یہ مطلب عدل سے نہیں بلکہ قسط ہی سے ادا ہوسکتا تھا لہٰذا عدل کی بجائے قسط استعمال ہوا۔

اسی طرح مفسّرین حضرات نے لِیَقُوْمَ النَّاسُ میں جو لامِ تعلیل ہے اس کی دلالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ رسولوں کے بھیجنے اور کتابوں کے اُتارنے کی علّت اور غرض یہ تھی کہ انسانی معاشرہ قسط و عدل کی بنیاد پر قائم ہو۔ علّامہ نیشاپوری نے رغائب الفرقان میں مذکورہ آیت کی تفسیر کے شروع میں لکھا ہے :- ثم اراد ان یبیّن الغرض من بعثۃ الرسل المؤید بالمعجزات و من انزال الکتاب و المیزان معھم : (پھر اس نے چاہا کہ وہ غرض بیان کرے جو معجزات کے ساتھ رسولوں کو بھیجنے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتارنے سے تھی !)

علّامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں : لیقوم الناس بالقسط علّۃ لانزال الکتاب و المیزان۔ تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں : بالعدل و ان

لا یظلم احدٌ احدًا علة لانزال الکتاب والمیزان۔ علّامہ ابوحیان تفسیر بحر المحیط میں لکھتے ہیں: ویجوز ان یکون علة لانزال الکتاب والمیزان معًا۔

ان چند عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانی ہدایت کے لیے وحی و رسالت کا جو سلسلہ قائم فرمایا جس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت محمّد رسول اللہ اور قرآن مجید ہیں وہ اس غرض سے قائم فرمایا کہ عدل اجتماعی وجود میں آئے۔

چونکہ رسولوں اور کتابوں کا مقصد انسانیّت کو وہ راہ دکھانا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتی اور دونوں جہان کی فلاح و کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ ان کا مقصد زبردستی اس راہ پر چلانا اور منزلِ مقصود تک پہنچانا نہیں جیسا کہ قرآن حکیم کی متعدّد آیات سے واضح ہوتا ہے۔ لہٰذا آیتِ مذکورہ کا مطلب یہ بنتا ہے کہ رسولوں اور کتابوں کے ذریعے انسانیّت کو جو نظامِ ہدایت اور دینِ حق دیا گیا اس کے اندر اس چیز کی پوری صلاحیت ہے کہ اگر انسانیّت اسے پوری طرح اپنالے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو عدلِ کامل پر مبنی وہ مثالی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے جس کی انسانیّت کو تلاش ہے۔ گویا اس آیت میں انسانیّت کو اُس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ امن و سکون کی زندگی کے لیے جس عادلانہ انسانی معاشرے کی تلاش و جستجو میں ہے۔ وہ معاشرہ اسے صرف اس نظامِ ہدایت اور دینِ حق کے ذریعے مل سکتا ہے جو وحی و رسالت کے توسّط سے وجود میں آیا اور جو آج اپنی صحیح شکل میں قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآنی نظامِ ہدایت اور دینِ حق کے اس پہلو کو علم و عقل کی روشنی میں دنیا پر واضح کیا جائے اور مسلمان اس کا چھوٹا موٹا عملی نمونہ بھی پیش کر دیں تو انسانیت دینِ اسلام پر جمع ہو سکتی اور دینِ حق کو تمام ادیان پر غلبہ حاصل ہو جا سکتا ہے۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ قرآنی نظامِ ہدایت کے عدلِ اجتماعی کے پہلو کو زیادہ سے زیادہ واضح کیا جائے اور عقلی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا جائے کہ صرف قرآنی نظامِ حیات ہی کے ذریعے وہ عدلِ اجتماعی قائم ہو سکتا ہے جس کے سائے میں ہر انسان کو پائیدار امن و اطمینان کی زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم کی نظر میں اجتماعی عدل و انصاف کی جو اعلیٰ اہمیّت ہے اس کا کچھ اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کی مختلف آیات میں لفظِ عدل بائیس[۲۲] جگہ اور لفظِ قسط و اقساط تیئیس[۲۳] جگہ انصاف کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، اور مسلمانوں کو اس کے اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی

ہے۔ مثلاً کہیں فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ط اور کہیں فرمایا: اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی۔ کہیں فرمایا: اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اور کہیں فرمایا: اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ، کہیں فرمایا: فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ اور کہیں فرمایا: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا، کہیں فرمایا: اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی اور کہیں فرمایا: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا۔ کہیں فرمایا: فَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ، اور کہیں فرمایا: فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّہٗ بِالْعَدْلِ

اسی طرح قِسط کے متعلّق کہیں فرمایا: قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ، اور کہیں فرمایا: اِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ۔ کہیں فرمایا: اَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ اور کہیں فرمایا: وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝ کہیں فرمایا:۔ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ اور کہیں فرمایا: کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ کہیں فرمایا: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ۔ اور کہیں فرمایا:۔ اُدْعُوْھُمْ لِاٰبَآئِھِمْ ھُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ۔ کہیں فرمایا: شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًام بِالْقِسْطِ۔ اور کہیں فرمایا: اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔

ان قرآنی آیات میں عدل اور قسط کی مختلف قسموں کا بیان اور حکم ہے، بعض میں عمومی عدل اور قسط کا حکم ہے اور بعض میں خصوصی عدل اور قسط کا حکم، بعض کے اندر معاشی عدل اور قسط کا حکم ہے، تو بعض کے اندر معاشرتی عدل اور قسط کا حکم، بعض کے اندر سیاسی عدل اور قسط کا حکم ہے تو بعض کے اندر قضائی اور قانونی عدل اور قسط کا حکم۔

اسی طرح چونکہ ظلم، عدل کی ضد اور نقیض ہے لہذا ظلم کی نفی سے عدل کا اثبات ہوتا اور ظلم کی مذمّت سے عدل کی مدح ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم میں ظلم کی مذمّت اور ممانعت کے متعلّق بکثرت آیات ہیں وہ بھی بالواسطہ طور پہ عدل سے متعلّق اور اُس کی اہمیّت پہ دلالت کرتی ہیں۔ ایسی آیات دوسو سے زائد ہیں۔ اور لفظ ظلم کا مختلف شکلوں اور صیغوں سے ۲۸۵ دوسو پچاسی جگہ ذکر ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن حکیم آخر عدل اجتماعی کو اتنی زیادہ اہمیّت کیوں دیتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا مقصد انسانیّت کو وہ راہ دکھانا ہے جس پہ چل کر وہ دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی حاصل کر سکتی ہے، بالفاظِ دیگر اُس کا مقصد انسان کو ان اُمور سے آگاہ کرنا ہے جن کے ساتھ اُس کی دُنیوی اور اُخروی فوز و

فلاح وابستہ ہے، اور چونکہ عدلِ اجتماعی انسان کی دُنیوی فلاح و کامیابی کے لیے بنیاد اور شرط کی حیثیّت رکھتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم اس کو بنیادی اور غیر معمولی اہمیّت دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان کی دُنیوی فلاح و کامیابی کا مطلب ہے اُسے ایسی زندگی مل جانا جو خوف و حُزن سے پاک اور امن و اطمینان سے آراستہ ہو، ایسی زندگی کو قرآنِ حکیم حیاتِ طیّبہ، حَسَنہ اور بُشریٰ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، سُورۂ یُونسؑ میں ہے:۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ٥ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ٥ (آگاہ رہو کہ جو اللہ کے دوست ہیں نہ اُن پر خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور متّقی رہے اُن کے لیے دُنیا کی زندگی میں بھی سامانِ خوشی ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کے کلمات کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے، یہ اُن کے لیے بڑی کامیابی ہے!)

سُورۃ النّحل میں ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (جس نے بھی نیک عمل کئے، مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مومن ہو ہم اُسے ضرور حیاتِ طیّبہ دیں گے اور ہم انہیں جو وہ کرتے رہے ہیں، بہتر اجر بھی ضرور دیں گے!۔ "مفسّرین حضرات نے لکھا ہے کہ حیاتِ کا تعلّق دنیا سے ہے۔")

سُورۃ النّحل میں ہے: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۚ (ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نیکی کی زندگی اختیار کی، اس دنیا میں حَسَنہ (بہترین زندگی) ہے اور آخرت کا گھر تو بہت بہتر ہے۔!)

سُورۃ النّحل کی آیت ہے: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۚ (اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیے گئے، ہم انہیں ضرور دنیا میں ٹھکانہ دیں گے اچھا!)

سُورۃ النّور کی آیت ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ٥ (اللہ کا ان لوگوں سے

وعدہ ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عملِ صالح کئے کہ وہ انھیں ضرور زمین میں خلافت اور سلطنت دے گا، جیسی کہ اُس نے اُن سے پہلوں کو دی اور اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو ضرور مضبوط کرے گا جو اُس نے اُن کے لیے پسند کیا اور اُن کی خوف کی حالت کو ضرور امن کی حالت سے بدلے گا!)

سورۂ بقرہ کی آیت ہے: فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی نہ ان پر خوف سوار ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے!)

سُورۃ الانعام کی آیت ہے: فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (پس جو ایمان لایا اور اُس نے نیکی و صلاح کو اختیار کیا، ایسے لوگوں پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین و رنجیدہ ہوں گے!)

سُورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں علّامہ ابوالسّعود نے لکھا ہے: والمعنیٰ عَنْ مَنْ تَبِعَ هُدَایَ مِنْکُمْ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ فِی الدَّارَیْنِ منْ لحوق مکروہ وَلَا هُمْ یحزنون من فوات مطلوب۔ (اور معنی ہیں جس نے تم میں سے میری ہدایت کی پیروی کی انہیں دونوں جہاں میں کسی ناگوار چیز کے لاحق ہونے کا خوف نہ ہوگا اور نہ وہ کسی مطلوب و محبوب چیز کے چھن جانے پر رنج و غم میں مبتلا ہوں گے!) خوف اور حزن کی تشریح میں حضرات مفسّرین اور ائمۂ لُغت نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ کہ مستقبل میں کسی مطلوب و مرغوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے اور چھِننے کے اندیشہ سے انسان کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے اُس کا نام خوف ہے اور خوف کی ضد امن ہے، اور ماضی میں کسی مطلوبہ چیز کے نہ ملنے یا تلف ہو جانے پر جو رنج و غم ہوتا ہے اُس کا نام حُزن ہے اور حُزن کی ضد فرحت و سرور ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی ناگوار اور خلافِ طبع چیز کے واقعہ ہو جانے کے بعد جو رنج و ملال ہوا کرتا ہے وہ حُزن ہے اور آئندہ کسی ناگوار اور خلافِ طبع چیز کی توقّع سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ خوف ہے اور یہ کہ حُزن کی نقیض، اطمینان و مسرّت اور خوف کی نقیض امن و سلامتی ہے۔

چونکہ جب ایک نقیض نہ ہو تو دوسرا نقیض ضرور پایا جاتا ہے، کیونکہ ارتفاعِ نقیضین محال ہے۔ لہٰذا حُزن کی نفی سے اطمینان و مسرّت کا اثبات اور خوف کی نفی سے امن و سلامتی کا اثبات ہو جاتا ہے، بنابریں کسی انسان کی زندگی میں حُزن نہ ہونے کا لازمی مطلب یہ بنتا ہے کہ اُس کو وہ تمام رُوحانی اور مادّی چیزیں حاصل ہیں جن سے انسان کے رُوحانی اور مادّی

تقاضوں کی تسکین اور تکمیل ہوتی اور اسے سکون و اطمینان حاصل اور نصیب ہوتا ہے اسی طرح کسی انسان کی زندگی میں خوف نہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے امن وسلامتی کے تمام اسباب و وسائل حاصل ہیں۔

امام فخر الدّین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے : جَمَعَ قَوْلُهٗ تَعَالیٰ (فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥) جميع ما اعدا الله لاوليائهٖ لان زوال الخوف يتضمن السلامة من جميع الأفات وزوال الحزن يقتضي الوصول الى كل اللذات والمرادات۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد " لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ " میں وہ تمام نعمتیں جمع ہو گئی ہیں جو اللہ نے اپنے دوستوں کے لیے تیار کی ہیں کیونکہ خوف کا نہ ہونا اپنے اندر تمام آفات و مصائب سے سلامتی کی ضمانت لیے ہوئے ہے۔ اور حُزن کا نہ ہونا اپنے اندر تمام لذّتوں اور مرادوں کے مل جانے کی اقتضاء رکھتا ہے۔

امن و اطمینان کا نعمت اور حزن و خوف کا مصیبت ہونا سورۃ النّحل کی اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے :

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ
اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا
رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ
بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ
الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا
يَصْنَعُوْنَ ٥

اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اُسے رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے مل رہا تھا، پس اُس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے بطورِ سزا اُس کو بھوک اور خوف میں مبتلا کیا بوجہ ان کرتوتوں کے جو اس بستی والے کرتے تھے !

بہرحال ایک پائیدار امن و اطمینان اور مستقل سُکھ چَین کی زندگی کے لیے اس سے زیادہ جامع مانع اور بہتر تعبیر ممکن نہیں جو قرآنِ حکیم نے خوف اور حُزن کی نفی سے کی ہے۔ بلاشبہ یہ تعبیر ایک معجزانہ اور نہایت بلیغ تعبیر ہے اور جوامع الکلم کی مصداق۔

غرضیکہ ایک ایسی زندگی جس میں خوف اور حُزن کے اسباب ناپید اور امن و اطمینان کے جملہ وسائل موجود ہوں انسان کو اس دنیا میں اگر حاصل ہو سکتی ہے تو صرف ایک ایسے معاشرے میں حاصل ہو سکتی ہے جس میں بالفعل ہر انسان کے ہر قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک

محفوظ ہوں اور آئندہ اُن کے محفوظ رہنے کی ضمانت ہو، کیونکہ حقوق کے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کو وہ سب رُوحانی اور مادّی، اور معنوی و صوری اشیاء حاصل ہیں۔ جن کے حاصل ہونے سے انسان کو امن و اطمینان ملتا، اور نہ حاصل ہونے سے حزن و ملال اور غم ہوتا ہے۔ لہٰذا مطلوبہ زندگی کا دار و مدار عدلِ اجتماعی کے قیام پر ہے۔

قرآنِ حکیم کی نظر میں عدلِ اجتماعی کی جو اعلیٰ اہمیّت اور اُس اہمیّت کی جو وجہ ہے اِس کے متعلّق اپنے علم و فہم کے مطابق کچھ عرض کر دینے کے بعد اب مَیں دوسرے سوال کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، دوسرا سوال یہ کہ عدلِ اجتماعی کو عمل میں لانے کے لیے قرآنِ حکیم جو نظامِ ہدایت پیش کرتا ہے وہ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدلِ اجتماعی کے عمل میں آنے کے لیے دو چیزوں کا وجود ازبس ضروری اور ناگزیر ہے: ایک خاص طرح کا ذہنی ماحول، اور دوسرے حقوق اور قوانین کا متعیّن و مخصوص ضابطہ۔ خاص طرح کے ذہنی ماحول سے مراد ہے۔ افراد کے ذہنوں میں عدل و انصاف کے نہایت وسیع اور عالمگیر جذبات پایا جانا جو ایک انسان کو بلا کسی تخصیص و امتیاز دنیا کے ہر دوسرے انسان کے ساتھ عدل و انصاف کرنے یعنی اُس کے حُقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرنے پر آمادہ کرتے اور ابھارتے ہیں اور جن کی تحریک سے ایک انسان ہر دوسرے انسان کے حقوق کا پُورا تحفّظ کرتا اور اُس میں ایک طرح کی خوشی و مسرّت پاتا ہے۔

جذباتِ عدل کے ساتھ مَیں نے وسیع اور عالمگیر کے الفاظ اس لیے استعمال کئے ہیں کہ اگر یہ جذبات وسیع اور عالمگیر نہ ہوں بلکہ خاص رنگ، نسل، قوم، قبیلے اور خاندان تک محدود ہوں تو ایسے جذبات ایک انسان کو صرف ان انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنے پر اُبھارتے ہیں جو اُس کے ساتھ اس خاندان، قبیلے، قوم اور نسل میں شریک ہوتے ہیں۔ اُن کے علاوہ دوسرے انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنے پر نہیں ابھارتے جو دوسرے خاندان، قبیلے، قوم و نسل وغیرہ سے تعلّق رکھتے ہوتے ہیں لہٰذا ایسی صورت میں بعض انسانوں کے حقوق کا تحفّظ ہوتا اور بعض کے حقوق کا تحفّظ نہیں ہوتا، اور جہاں بعض لوگوں کے حقوق کا تحفّظ ہو اور دوسرے بعض کے حقوق کا تحفّظ نہ ہو، وہاں عدلِ اجتماعی کبھی وجود میں نہیں آ

سکتا، کیونکہ عدل اجتماعی اس وقت وجود میں آتا ہے جب سب انسانوں کے ہر قسم کے حقوق کا کامل طور پر تحفّظ ہوتا ہے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ جہاں تک مطلق عدل و انصاف کے احساس و جذبے کا تعلّق ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے لیکن شعور کے درجات کے لحاظ سے کہیں اُس کا دائرہ فرد کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے اور کہیں اُس کا دائرہ خاندان تک محدود، کہیں اس کا دائرہ قبیلے تک محدود ہوتا ہے اور کہیں قوم و وطن تک محدود۔ مطلب یہ کہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ بعض افراد اپنے ذاتی حقوق کے معاملہ میں نہایت حسّاس اور مستعد ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی اُن کے کسی حق پہ دست درازی کرتا ہے تو اُس کے تحفّظ کے لیے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے اور دوسرے کو ظالم کہتے ہیں۔ لیکن یہی افراد جب دوسروں کی حق تلفی کرتے یا حق تلفی ہوتی دیکھتے ہیں تو ان کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ظلم کے مرتکب اور ظلم کو برداشت کر رہے ہیں، اور بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے خاندان کے کسی فرد کے حقوق کا معاملہ ہو تو اُس میں وہ پورے شدّ و مدّ کے ساتھ عدل کی حمایت کرتے ہیں لیکن وہی معاملہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کا ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کی حمایت نہیں کرتے بلکہ مخالفت پر اُتر آتے ہیں اور انہیں خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اُن کے قبیلے یا قوم کے حقوق کا معاملہ ہو تو عدل و انصاف کی بات کرتے اور اُن کی حفاظت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور حق تلفی کرنے والے کو ظالم اور غاصب کے لفظ سے یاد کرتے ہیں لیکن دوسرے قبائل اور اقوام کے حقوق کے معاملہ میں ان کا رویّہ غیر عادلانہ بلکہ بعض دفعہ کھُلے طور پہ ظالمانہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کے احساسِ عدل کا دائرہ تنگ اور محدود ہوتا ہے۔

بہرحال عدل و انصاف کے ان محدود جذبات میں سے کوئی جذبہ بھی ایسا نہیں جس سے مطلوبہ عدلِ اجتماعی عمل میں آ سکتا ہو۔ مطلوبہ عدل اجتماعی کے عمل میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے ذہنوں میں عدل و انصاف کا جذبہ نہایت وسیع اور عالمگیر شکل میں پایا جاتا ہو۔

دوسری چیز جو عدلِ اجتماعی کے وجود میں آنے کے لیے ضروری ہے، وہ ایک ایسا ضابطہ حقوق و قوانین ہے جو انسانی فطرت اور اُس کے تقاضوں سے پوری مطابقت رکھتا ہو کیونکہ دراصل ایک ایسا ہی ضابطۂ حقوق اور مجموعۂ قوانین پوری انسانیت کے لیے قابلِ قبول اور

قابلِ عمل ہو سکتا ہے جو انسانی فطرت پر مبنی اور انسان کے فطری تقاضوں کے مطابق ہو یعنی اس پر عمل کرنے سے انسان کے تمام فطری تقاضے پورے ہو سکتے ہوں۔

قرآن حکیم چونکہ عدلِ اجتماعی کا علمبردار ہے، لہٰذا مذکورہ دونوں ضرورتوں کے پورے ہونے کا اُس کے پاس بہتر سے بہتر سامانِ ہدایت ہے۔ تعلیم و تربیت کا وہ نظام بھی موجود ہے جس سے مطلوبہ ذہنی ماحول تیار ہو سکتا ہے، اور وہ اُصولی ہدایات و تصوّرات بھی موجود ہیں جن سے مطلوبہ ضابطۂ حقوق و قوانین سامنے آتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے قرآنی نظام سے مراد ایمانی عقائد اور دینی عبادات کا نظام ہے۔ ایمانی عقائد اور اسلامی عبادات سے جہاں بہت سے دوسرے روحانی اور مادّی مقاصد حاصل ہوتے ہیں وہاں ذہنی ماحول بھی وجود میں آجاتا ہے جو عدلِ اجتماعی کے لیے شرط کی حیثیّت رکھتا ہے یعنی انسان کے ان اخلاقی احساسات و جذبات میں عالمگیر وسعت پیدا ہو جاتی ہے جو ہر انسان کے اندر محدود شکل میں موجود ہوتے ہیں اور اس کا ذہن عدلِ اجتماعی کے قابل بن جاتا ہے۔

مثلاً ایمانی عقائد میں سے اللہ کی ذات و صفات کے عقیدہ کو لیجیے۔ یہ عقیدہ جس انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہو اس کے اخلاقی احساسات میں عالمگیر وسعت پیدا ہونا ایک بالکل لازمی بات ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کئی صفات ایسی ہیں جو اپنے مفہوم میں پوری انسانیت کا تصوّر لیے ہوئے ہیں جیسے ربّ العالمین، ربّ النّاس، ملک النّاس، الٰہ النّاس، رحمان و رحیم، وغیرہ ــــ ربّ العالمین کا مفہوم ہے: "تمام جہانوں اور تمام قوموں کا پروردگار اور پالنہار" ــــ ربّ النّاس کا مفہوم ہے: "سب انسانوں کا پروردگار" ــــ ملک النّاس کا مفہوم ہے: "سب انسانوں کا بادشاہ" ــــ الٰہ النّاس کا مفہوم ہے: "پوری انسانیت کا معبود!" اور رحمان و رحیم کا مفہوم ہے: "سب مخلوقات اور تمام انسانوں پر رحمت و مہربانی کرنے والا!" اسی طرح رزّاق کا مفہوم ہے: "تمام جانداروں اور سب انسانوں کو روزی، رزق دینے والا" اسی طرح اللہ کی یہ صفت کہ وہ سب کے ساتھ یکساں عدل کرنے والا ہے اور اس کے قانونِ جزاء و سزا کا سب انسانوں کے ساتھ مساوی تعلّق ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کی ان صفات پر ایمان رکھتا اور ان کے تقاضوں کو سمجھتا ہو اس کے اندر تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی اور عدل و انصاف کرنے کا عالمگیر جذبہ اُبھرنا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔ ایسا شخص نہ صرف یہ کہ دنیا کے ہر انسان کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا بلکہ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار کرتا

ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کو جتنا عدل پسند ہے اس سے کہیں زیادہ احسان پسند ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ٥ کا علم اس کو احسان کرنے یعنی اپنے حق کا دوسروں کے لئے ایثار کرنے پہ آمادہ کرتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق یہ عقیدہ کہ آپ کسی خاص قوم کے رسول نہیں بلکہ کافۃً للنّاس اور پوری انسانیت کے رسول اور اقوامِ عالم کے لئے رحمت ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک پوری انسانیت کے لئے کتابِ رحمت وہدایت ہے۔ یہ دونوں عقیدے بھی مسلمان کے ذہن میں عالمگیر وسعت پیدا کرتے اور اُسے بلاتخصیص رنگ ونسل، بلاامتیاز لسان ولباس، بلاتمیز قوم ووطن، اور بلاتفریق قبیلہ وخاندان ہر انسان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور اُسے نفع پہنچانے پہ آمادہ کرتے ہیں۔

اسی طرح غور سے دیکھا جائے تو آخرت کی جزاوسزا کا عقیدہ بھی عدل اجتماعی کے قیام میں بڑی مدد دیتا ہے، وہ اس طرح کہ جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے مسلسل جدّوجہد کرتے رہنا اس کا اسلامی فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر اُسے آخرت میں عظیم اجر و ثواب ملے گا وہ دنیا کی ناکامیوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور کبھی ہمّت ہار کے بیٹھ نہیں جاتا بلکہ آخر دم تک متواتر اور پیہم جِدّوجُہد اور سعی وکوشش میں مصروف رہتا ہے اور کبھی اس راہ سے نہیں ہٹتا۔

پھر جس طرح ایمانی عقائد وہ خاص قسم کا ذہنی ماحول پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جو عدلِ اجتماعی کے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح اسلامی عبادات اُس ذہنی ماحول کو پائیداری کے ساتھ قائم رکھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اسلامی عبادات سے ایک طرف ذہنوں میں ایمانی عقائد اور ان پہ مبنی اخلاقی احساسات زندہ اور بیدار رہتے ہیں تو دوسری طرف ان سے افراد کے اندر عدلِ اجتماعی کی عملی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بالخصوص صلوٰۃ جو دن رات میں پانچ مرتبہ فرض ہے انسان کے ذہن میں یادِ الٰہی کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہے اور سورۂ فاتحہ کے برابر پڑھتے اور دہراتے رہنے سے مسلمان کے ذہن میں ان صفاتِ الٰہی کا اعتقاد اجاگر رہتا ہے جو سورۂ فاتحہ میں بیان ہوئے ہیں، یعنی ربوبیّتِ عامّہ، رحمتِ شاملہ اور آخرت میں بے لاگ عدالت اور جزا وسزا کا اعتقاد، اسی

طرح صلوٰۃ چونکہ عملی عبادت ہے جو پانچ وقت مسجد میں ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ ایک امام کی اتّباع میں ادا کی جاتی ہے لہٰذا اس سے انسان کے اندر عدل اجتماعی قائم کرنے اور قائم رکھنے کی عملی صلاحیت پیدا ہوتی اور اس سے دوسرے متعدّد تمدّنی و اجتماعی فائدے بھی ظہور میں آتے ہیں۔

اسی طرح زکوٰۃ، روزے اور حج سے بھی انسان کے اندر جہاں تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے، وہاں عدلِ اجتماعی کے قیام کے لئے عملی صلاحیّت بھی ابھرتی ہے اور انسان اس قابل بنتا ہے کہ قیامِ عدلِ اجتماعی کے فریضہ کو بآسانی ادا کر سکے۔ گویا عبادات سے مسلمان کو عدل اجتماعی قائم کرنے کی عملی تربیت ملتی ہے۔

یہاں اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایمانی عقائد اور اسلامی عبادات کے متعلّق جو کچھ کہا گیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پھر مسلمان معاشروں میں یہ کیوں نظر نہیں آتا تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ایمانی عقائد کے متعلّق جو کچھ کہا گیا ہے یہ اس صورت میں ہے جب ایمانی عقائد صحیح شکل میں اور عام طور پر ذہنوں میں راسخ اور پیوست ہوں، موجودہ مسلمان معاشروں میں زبانی الفاظ کی حد تک اگرچہ ایمانی عقائد کا چرچا بہت ہے لیکن ایسا بہت کم اور شاذ و نادر ہے کہ وہ ایمانی عقائد اپنی صحیح شکل میں ذہنوں کے اندر راسخ اور پیوستہ ہوں۔ اسی طرح اسلامی عبادات پر مذکورہ اثرات اس وقت مرتّب ہوتے ہیں جب وہ عبادات صحیح ایمانی عقائد کے ساتھ اس طرح ادا کی جائیں جس طرح کہ شارع کا حکم ہے۔

قرآن حکیم میں عدلِ اجتماعی کے لئے جو ضابطۂ حقوق و قوانین ہے اسے پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حقوق دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو انسان کو کسی دوسری حیثیّت سے نہیں بلکہ صرف انسان کی حیثیّت سے حاصل ہوتے ہیں ان کے حصول میں نہ تو انسان کی کسی سعی و محنت کا دخل ہوتا ہے اور نہ ان کے مقابلہ میں فرائض ہوتے ہیں۔ اس قسم کے حقوق کو انسانی (ہیومن رائٹس) بنیادی حقوق (فنڈیمنٹل رائٹس) اور قدرتی حقوق (نیچرل رائٹس) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کے نام سے اس لیے کہ یہ انسان کو محض انسان ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ بنیادی حقوق کے نام سے اس وجہ سے کہ یہ دوسری قسم کے حقوق کے لیے بنیاد کی حیثیّت رکھتے ہیں، اور قدرتی حقوق کے نام سے اس لئے کہ یہ انسان کو اس کی کسی سعی و محنت کے نتیجہ میں نہیں بلکہ قدرت کی طرف سے بطور عطیہ

حاصل ہوتے ہیں، اور چونکہ یہ حقوق انسان کو محض انسان ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں، لہٰذا ان میں کسی انسان کو دوسرے پر ترجیح اور برتری نہیں ہوتی بلکہ بلا کسی تخصیص و استثناء سب انسان ان میں مساوی اور برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے حقوق وہ ہیں جو ایک انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوسری حیثیات سے حاصل ہوتے ہیں۔ اُن کے حصول میں انسان کی کوشش و محنت کا بھی دخل ہوتا ہے اور ان کے مقابلہ میں فرائض بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقوق کی اس قسم کو کسبی، اضافی اور نسبتی حقوق کہا جاتا ہے۔ ان حقوق میں انسانوں کے مابین مساوات و برابری نہیں ہوتی بلکہ بعض حقوق بعض کو حاصل ہوتے ہیں اور بعض کو حاصل نہیں ہوتے۔ اِن حقوق کی مثال جیسے باپ اور بیٹے، شوہر اور بیوی، اجیر و مستاجر، بائع اور مشتری، حاکم اور محکوم، استاذ اور شاگرد کے ایک دوسرے پر حقوق۔

پہلی قسم کے حقوق کا قرآنِ حکیم میں خاص اسلوب سے بیان ہے وہ یہ کہ ان کو انسانیت کے لئے عام نعمتوں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم ان آیات کو سامنے لانے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ در اصل ان انسانی حقوق کی بنیاد اس تصوّر پر قائم ہے کہ پیدائشی لحاظ سے سب انسان مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ کوئی انسانی بچّہ بوقتِ پیدائش نہ شریف ہوتا ہے نہ رذیل، نہ اعلیٰ ہوتا ہے نہ ادنیٰ، اور نہ مقدّس ہوتا ہے اور نہ نجس، اور کسی کو کسی پر کوئی فضیلت اور برتری نہیں ہوتی۔ شاہی محل میں پیدا ہونے والے شہزادے اور جھونپڑی میں جنم لینے والے فقیر زادے۔ نبی، ولی اور عالم کے گھر میں تولّد ہونے والے نونہال اور کافر، فاجر اور جاہل کے گھر میں آنکھ کھولنے والے بچّے میں آدمیت اور انسانی شرف کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ سب ایک درجہ میں ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت قرآنِ حکیم کی ان آیات سے فراہم ہوتا ہے جن میں سب انسانوں کی اصل: تُراب، طین، نفسِ واحدہ اور ایک مرد و عورت یعنی آدم اور حوّا کو بتلایا گیا ہے مثلاً سورۂ فاطر کی آیت ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًاؕ (اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر اُس نے تمھیں جوڑے جوڑے بنایا!)

سورۃ الانعام میں ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًاؕ (وہ اللہ جس نے تم کو گارے سے پیدا کیا اور پھر مقرّر کیا ایک وقت۔

سُورۃ السّجدہ کی آیت ہے: اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ

طِیْنٍ ٥ (وہ کہ جس نے ہر شے کو حسن کے ساتھ پیدا کیا اور تخلیق انسان کی ابتداء گارے سے کی!)

سورۃ النّساء کی پہلی آیت ہے: یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ ط (اے لوگو! اپنے اس ربّ کی ناراضگی سے بچو جس نے تمھیں ایک نفس سے پیدا کیا! وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ٥ اور اُس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا اور پھیلائے ان دونوں سے کثیر مرد اور عورتیں!)

سورۃ الاعراف میں ہے: ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا (اللہ وہ ہے جس نے تمھیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے سکون پائے!)

سورۃ الحجرات کی آیت ہے: یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اے انسانو ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اور یاد رکھو تم میں سے زیادہ عزّت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے!)

قرآنِ حکیم کی اس آخری آیت سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انسان ایک مرد و عورت سے پیدا ہوئے ہیں اور سب کا شجرۂ نسب حضرت آدم اور حضرت حوّا علیہما السّلام سے جا کر مل جاتا ہے، وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رنگ، نسل، اور نسب وغیرہ اسباب فضیلت نہیں بلکہ فضیلت کا واحد سبب تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع کے بعض حصّے اس آیتِ مبارکہ کی مزید تفصیل پیش کرتے ہیں، جن کا ترجمہ ہے: آگاہ ہو جاؤ کہ تم سب آدم کے بیٹے ہو جو مٹی سے پیدا ہوا، تم میں سے کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت، نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت، فضیلت کا سبب صرف تقویٰ ہے!

انسانی وحدت و مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سب انسان اپنی انسانی فطرت میں برابر ہیں اور سب کے وہ بنیادی فطری تقاضے یکساں ہیں جن کی تکمیل کے بغیر انسان اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ قرآن حکیم کی آیت ہے: فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط (اللہ کی تجویز کردہ فطرت جس پر اُس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے۔) لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ سب انسانوں کے درمیان بنیادی انسانی حقوق میں مساوات و برابری ہو کیونکہ

اس کے بغیر انسانی وحدت و مساوات کا لفظ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

مثال کے طور پہ ہندو مذہب کو لیجئے کہ وہ انسانی مساوات کا نہیں بلکہ تفاوت کا قائل ہے کیونکہ وہ انسانوں کو پیدائشی لحاظ سے اعلیٰ و ادنیٰ چار مختلف طبقوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن عملاً اس تفاوت کا اظہار ان حقوق و فرائض سے ہوتا ہے جو اُس نے ہر طبقہ کے لیے الگ الگ مقرر کئے ہیں۔ اسی طرح مثلاً جو عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گورا انسان پیدائشی لحاظ سے کالے انسان سے بہتر اور افضل ہے وہ اس کا عملی اظہار ان مختلف حقوق و فرائض سے کرتے ہیں جو انہوں نے گوروں اور کالوں کے لئے الگ الگ مقرر کر رکھے ہیں۔

مطلب یہ کہ انسانی مساوات یا عدمِ مساوات کا مطلب عملی طور پر حقوق کی مساوات اور عدم مساوات سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں انسانی مساوات کا جو تصوّر ہے اُس سے مراد بنیادی انسانی حقوق میں مساوات ہے۔

قرآنِ حکیم میں بنیادی انسانی حقوق کا جو تصوّر ہے وہ دراصل اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہر انسان کو اپنی طبعی عمر تک اطمینان و امن کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے لیکن امن و اطمینان راہبانہ اور جوگیانہ قسم کا نہیں جو جنگلوں اور غاروں کی تنہائی میں مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعے فطری تقاضوں کو مٹا کر حاصل کیا جاتا ہے بلکہ وہ امن و اطمینان جو آبادی میں رہ کر اسباب و وسائل کے ذریعے تمام جسمانی اور رُوحانی، مادّی اور عقلی، طبعی و جبلّی تقاضوں کی تکمیل و تسکین سے انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اُسے وہ تمام رُوحانی اور مادّی اسباب و وسائل حاصل ہوں جن کے بغیر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک اطمینان و سکون کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ تفصیل کے درجہ میں قرآن حکیم ایسے تمام رُوحانی و مادّی اسباب و وسائل کو انسانی حقوق قرار دیتا اور چاہتا ہے کہ ہر انسان کو یہ حقوق حاصل ہوں تاکہ وہ اپنی طبعی عمر تک اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکے، اور ساتھ ہی ایسے اصول و ضوابط تجویز کرتا ہے جن کی پابندی سے ہر انسان کو وہ اسباب و وسائل حاصل ہو جاتے ہیں جن پر پائیدار امن و اطمینان کا دارومدار ہے۔

بنیادی انسانی حقوق کے متعلّق، نیز اُن اصولوں کے متعلّق جن کی پابندی سے بنیادی انسانی

حقوق کا تحفّظ ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جو ہدایت و راہنمائی ہے اُسے پُوری تفصیل کے ساتھ اس مختصر مقالے میں پیش نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے ایک مستقل مقالے بلکہ کتاب کی ضرورت ہے اس مقالے میں اس کا مختصر خلاصہ ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ایک انسان کو اپنی طبعی عمر تک اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ایک چیز رزق و مال ہے۔ انسان کے اندر غذا، لباس اور مکان کے جو فطری و طبعی تقاضے ہیں وہ رزق و مال ہی کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی بعض معاشرتی ذمّہ داریاں جن کے ادا کئے بغیر معاشرتی تعلقات قائم نہیں رہ سکتے، مال کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ لہٰذا قرآنِ حکیم ہر انسان کا یہ انسانی حق قرار دیتا ہے کہ اُس کے پاس رزق و مال ہو، اس کا ثبوت قرآنِ حکیم کی اُن آیات سے فراہم ہوتا ہے جن میں بنی نوعِ انسان کو مخاطب کر کے بطورِ احسان یہ فرمایا گیا ہے کہ زمین میں جمادات نباتات اور حیوانات کی شکل میں جس قدر وسائل رزق و مال اور اسبابِ معاش ہیں یہ اللہ نے تم سب کے تمتّع و انتفاع کے لئے پیدا فرمائے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کو اُن قدرتی اشیا میں تصرّف کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قدرت اور صلاحیّت اس لئے عطا کی ہے کہ تم ان اشیاء میں تصرّف کر کے ان سے فائدہ اٹھاؤ۔

سورۂ البقرہ کی آیت ہے: وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (اور اُس نے آسمان سے پانی برسایا اور نکالے اُس کے ذریعے پھل اور غلّے تمہارے رزق کے لئے!) نیز سورۂ بقرہ میں ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ہ (وہ اللہ جس نے تمہارے انتفاع کے لئے زمین کی سب چیزوں کو پیدا کیا ہے!) سورۃ الاعراف کی آیت ہے: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ط (اور بے شک ہم نے تم کو زمین میں متمکّن کیا اور تمہارے لئے اس میں سامانِ معاش رکھا!) سورۂ ملک میں ہے: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (وہ اللہ جس نے زمین کو تمہارے لئے روندے جانے کے قابل بنایا، پس تم اُس کے راستوں میں چلو اور اُس کے رزق سے کھاؤ!) طعام کے متعلّق سورۂ عبس کی آیت ہے: فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖٓ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ہ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ہ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ہ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ہ وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا ہ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا

وَّفَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے طعام پر غور کرے اور دیکھے کہ ہم نے خوب پانی برسایا، پھر زمین کو خاص طرح سے پھاڑا، پس اُگایا اُس میں غلّہ، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور، اور گھنے باغ اور پھل اور چارہ تمہارے لئے اور تمہارے مولیشیوں کے لئے!)

لباس کے متعلّق سورۃ الاعراف میں ہے: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا ط (اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو ستر پوشی کا کام بھی دیتا ہے اور حفاظت اور زینت کا بھی!) گھر کے متعلّق سورۃ النّحل کی آیت ہے:- وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَیَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ۝ (اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو جائے سکونت اور سکون بنایا، اور تمہارے لئے چوپاؤں کی کھالوں سے گھر یعنی خیمے بنائے جنھیں تم قیام اور کوچ دونوں حالتوں میں ہلکا پھلکا پاتے ہو، اور اُن کے اُون اور اُن کے پشم اور اُن کے بالوں سے تمہارے لئے گھریلو استعمال کی چیزیں بنائیں، یہ سب چیزیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانے کے لئے!)

چونکہ ان مذکورہ آیات کے سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے نیز ان کے مضمون سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُن کا تعلّق نوعِ انسان کے ہر ہر فرد سے ہے، اور ان میں کُمْ کی جو ضمیریں ہیں اُن کے مخاطب دنیا کے سب انسان ہیں خواہ وہ کسی رنگ ونسل اور قوم وقبیلے اور کسی خاندان وکنبے سے تعلّق رکھتے اور کسی زمان ومکان میں پائے جاتے ہوں، لہٰذا ان آیاتِ قرآنیہ کا یہ تقاضا ہے کہ بنی نوعِ انسان کا کوئی فرد، رزق، سامانِ معاش، طعام، لباس اور مکان وغیرہ سے محروم نہ رہے بلکہ یہ چیزیں کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی معیار پر ہر انسان کو میسّر ہونی چاہئیں۔ کیونکہ یہ پوری انسانیت کے لئے اللہ کی نعمتیں ہیں۔ پھر اس کے لئے قرآنِ حکیم کی مختلف آیات میں کچھ اُصُول وضوابط بیان ہوئے ہیں، جن کی پابندی سے معاشرے کے ہر ہر فرد کو مذکورہ معاشی ضروریات میسّر آجاتی ہیں۔ وہ اُصُول وضابطے قرآنِ حکیم کی جن آیات سے مستنبط اور مفہوم ہوتے ہیں اُن آیات کو نقل کرنے اور ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے سے مقالہ بہت طویل ہوجائے گا۔ لہٰذا طوالت سے بچتے ہوئے صرف

اُن اُصُول وضوابط کو ذکر کرتا ہوں جو مَیں اپنے علم وفہم کے مطابق قرآنِ حکیم کی مختلف آیات سے سمجھ سکا ہوں :

۱ - جو شخص کسی قسم کی کوئی معاشی جدّ و جُہد کر سکتا ہو اُس پر لازم ہے کہ وہ ضرور کرے تاکہ اُس کی وہ صلاحیّتیں بیکار ضائع نہ ہوں جو اللہ نے اس مقصد کے لئے اسے عطا فرمائی ہیں اور جن کے پروان چڑھنے میں معاشرے کے دوسرے افراد کی کوششوں کا بڑا دخل ہوتا ہے لہٰذا وہ مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں اس شخص کی اُن معاشی صلاحیّتوں سے فائدہ پہنچے۔

۲ - جو شخص کسی قسم کا کوئی مفید معاشی کام کاج کر سکتا ہو اُس کے لئے اس کا موقعہ ہونا چاہئے، تاکہ وہ ان قدرتی وسائلِ رزق سے استفادہ کر سکے جن سے استفادے کا حق اُسے اللہ کی طرف سے بحیثیت انسان کے حاصل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ دوسرا اُصُول پہلے اُصُول پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کیونکہ کام کرنے کے لئے کام کا موقعہ ہونا ضروری ہے۔

۳ - قدرتی اشیاء میں سے جب تک کوئی شے اپنی قدرتی حالت پر باقی و برقرار ہو وہ ہر انسان کے استفادے کے لئے عام اور مُباح ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اس کے متعلق اپنی ملکیّت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیز صرف میرے استفادہ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ اس سے ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے جو باطل ہے۔

۴ - جس قدرتی شے کو کوئی شخص سبقت کر کے سب سے پہلے اپنے تصرّف میں لائے اور اس کی صورت وشکل میں اس طرح کا کوئی تغیّر و تبدّل کر دے جس سے اُس شے کی قدرتی افادیّت میں کچھ مزید افادیّت پیدا ہو جائے تو یہ شے اُس خاص شخص کے استفادہ کیلئے مخصوص ہو جاتی ہے اب دوسرا کوئی اس شخص کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس شے سے استفادہ نہیں کر سکتا، کیونکہ ہر شخص اپنی سعی ومحنت سے پیدا شدہ مفید اثرات کا خود مستحق ہے، یہ اصول دراصل حقِ ملکیّت سے متعلّق ہے۔

۵ - جب ایک شخص کی مملوکہ شے دوسرے کی طرف ایسے طریقہ سے منتقل ہو جس طریقہ میں مالک کی رضامندی موجود ہوا کرتی ہے تو وہ دوسرا شخص اُس شے کا مالک قرار پا جاتا ہے اب اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر کوئی اُس شے سے مستفید نہیں ہو سکتا، یہ اُصُول انتقالِ ملکیّت سے متعلّق ہے۔

۶ - کسی شخص کی محنت ومشقّت کی اُجرت مقرّر کرنے میں ضروری ہے کہ محنت کی نوعیّت

اور مقدار کا لحاظ رکھا جائے، جیسی اور جتنی کسی کی محنت و مشقّت ہو اُس کے مطابق اُس کی اُجرت مقرّر کی جائے کیونکہ نوعیّت کے لحاظ سے محنت کے مختلف درجے ہیں، بعض محنتوں میں انسان کی توانائی زیادہ صرف ہوتی اور بعض میں کم ہوتی ہے۔ اسی طرح افادیّت کے لحاظ سے بھی مختلف محنتوں کے درمیان فرق ہوتا ہے، لہذا عقل و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی اُجرتوں میں بھی فرق ہونا چاہیئے۔

۷۔ جو دماغی جسمانی محنت نوعیّت کے لحاظ سے معمولی سے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی ہو اُس کی بھی یومیہ مقدار مثلاً چھ سات گھنٹوں کی کم از کم اتنی اُجرت ضرور مقرّر کی جائے جس سے گو معمولی سے معمولی اور سادہ سے سادہ معیار پر ہی لیکن محنت کرنے والے کی بنیادی معاشی ضروریات روزانہ پوری ہو سکتی ہوں۔

۸۔ تبادلے اور لین دین کی صرف وہی شکلیں جائز اور درست ہیں جن میں ہر فریق کے لئے کسی نہ کسی صورت میں اُس کی شے کا معاوضہ موجود ہوتا ہے جو اُس کی رضامندی کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔

۹۔ مشترکہ کاروبار کی صرف وہی صورتیں جائز اور درست ہیں جن میں ہر شخص اپنی دماغی جسمانی محنت کی بنا پر منافع کا مستحق قرار پاتا ہو اور وہ صورتیں ناجائز اور حرام ہیں جن میں ایک فریق بغیر کسی محنت و مشقّت کے محض اس سرمائے کی بنا پر منافع کا مستحق قرار پاتا ہو جو تحفّظ کی ضمانت کے ساتھ کاروبار میں استعمال ہو رہا ہے کیونکہ ایسی تمام صورتیں ربٰا کے حکم میں آتی ہیں۔

۱۰۔ معاشرے کے جو افراد بچپنے، بڑھاپے اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے معذور اور نادار ہوں اور اُن کے قرابتداروں میں کوئی اُن کی معاشی کفالت کرنے والا نہ ہو تو ان کی معاشی ضروریات پورا کرنے کی ذمّہ داری معاشرے کے دوسرے افراد پر ہے، بیت المال ہو تو اُس کے ذریعے ورنہ کسی دوسرے طریقہ سے ان کے لئے معاشی ضروریات مہیّا کی جائیں یعنی زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کے فنڈ سے۔

۱۱۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو، رہن سہن کا ایسا معیار زندگی اختیار نہیں کر سکتا جسے معاشرے کی عظیم اکثریّت اختیار نہ کر سکتی ہو، کیونکہ اس سے توازن بگڑتا اور طرح طرح کی خرابیاں وجود میں آتی ہیں۔

یہ جو چند اصول و ضوابط عرض کئے گئے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی معاشرہ ان پر عمل پیرا ہو جائے تو دو اور دو چار کی طرح اس کے ہر ہر فرد کو بقدرِ ضرورت سامانِ معاش بھی میسّر آ جاتا ہے اور ہر ایک کو متوازن معاشی ترقّی کا موقعہ بھی مل جاتا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ کوئی فرد بنیادی معاشی ضروریات سے محروم نہیں رہتا، بلکہ ضرورت سے زیادہ مال حاصل کر سکنے کا اس کے لیے مساوی موقعہ بھی مہیّا ہو جاتا ہے، آگے اُس کی مرضی کہ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے۔

اسی طرح جن چیزوں کے بغیر انسان اپنی طبعی عمر تک امن و اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان میں سے ایک چیز دین و مذہب ہے کیونکہ انسان کے کچھ رُوحانی، اخلاقی اور عقلی تقاضے ایسے ہیں جو صرف دینی عقائد اور مذہبی اعمال و رسوم ہی سے پورے ہوتے اور تسکین پاتے ہیں۔ اللہ کی معرفت، محبت اور عبادت و اطاعت سے رُوح کو اطمینان و سکون ملتا اور وہ ترقّی کرتی اور تقویّت پاتی ہے، اور جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا ایمانی عقائد سے اخلاقی احساسات میں عالمگیر وسعت پیدا ہوتی اور اسلامی عبادات سے ان کو غذا ملتی اور ہمیشہ زندہ و بیدار رہتے ہیں اور انسان اس عادلانہ عملی نظام پر عمل کرنے کے قابل بنتا ہے جس کے ساتھ اس کی فلاح و بہبود وابستہ ہے، نیز دین سے انسانی عقل کو ان مشکل سوالات کا اطمینان بخش جواب ملتا ہے جو کائنات کے وجود، اُس کے عجیب و غریب نظام، اُس کی ابتداء و انتہاء، کائنات میں انسان کے مقام، انسان کے مبداء و معاد اور مقصدِ تخلیق، انسان کی بہ نسبت خیر و شرّ اور سعادت و شقاوت کی حقیقت کے متعلق پیدا ہوتے اور عقل کو بے چین کرتے ہیں۔ اسی طرح معاشرتی اور تمدّنی زندگی کے کئی پیچیدہ اور مشکل مسائل جو عقل سے حل نہیں ہوتے، دین سے ان کا تسلّی بخش حل مل جاتا ہے۔ بنابریں قرآنِ حکیم ہر انسان کا یہ انسانی حق مانتا ہے کہ اس کے لئے ایسے دین و مذہب کا انتظام ہو جو اُس کی مذکورہ ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہو۔ اس کا ثبوت قرآنِ حکیم کی ان بکثرت آیات سے فراہم ہوتا ہے، جن میں انسانیت کو دینی عقائد، اخلاق اور عبادات اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی یہ آیت :- یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(اے انسانو! اپنے اس پروردگار کی عبادت و بندگی کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم تقویٰ سے آراستہ ہو جاؤ!)

اسی طریقہ سے یہ ظاہر ہے کہ ایک فرد جب تک اُن حقوق و فرائض کا علم نہ رکھتا ہو جو اس کی مختلف حیثیات کی وجہ سے اس کے ذمہ پر عائد ہوتے ہیں اور جن کی ادائیگی سے معاشرتی تعلقات سُدھرتے اور عدم ادائیگی سے بگڑتے ہیں، اس وقت تک وہ اپنے متعلقہ حقوق و فرائض کو بصیرت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا قرآن مجید ہر انسان کا یہ حق قرار دیتا ہے کہ اُس کے لئے کم از کم اتنی تعلیم کا انتظام ضرور ہو جس سے اُسے اپنے متعلقہ حقوق و فرائض کا علم ہو سکے، نیز اُن امور کا علم ہو سکے جن کے علم سے انسان کے اندر اپنے حقوق و فرائض ادا کرنے کی صلاحیت اور معاشی امور انجام دینے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ اس حق پر قرآنِ حکیم کی وہ آیات دلالت کرتی ہیں جن میں علم کی فضیلت اور ضرورت کا بیان ہے مثلاً سورۃ البقرہ کی آیت ہے :- كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (جیسے کہ اُس نے تمہارے اندر رسول بھیجا جو تم پر اُس کی آیات تلاوت کرتا اور تمہارا تزکیہ کرتا اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا، اور اُن امور کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے!) — اسی طرح ان چیزوں میں سے جن کے بغیر انسان اپنی طبعی عمر تک اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا، ایک چیز خاندان ہے۔ انسان کے اندر حفاظتِ نسل کے تحت جو جبلّی تقاضا ہے، وہ خاندان کے ذریعے پورا ہوتا ہے اور خاندان مرد و عورت کے ازدواجی تعلق سے وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم ہر جوان مرد و عورت کا یہ انسانی حق قرار دیتا ہے کہ اس کے لئے تعلقِ ازدواج اور خاندان کا انتظام ہو۔ یہ حق قرآن مجید کی اُن آیات سے مفہوم ہوتا ہے جن میں تعلقِ ازدواج، رشتۂ مصاہرت اور اولاد و احفاد کو انسانیت کے لئے بطور ایک نعمت کے ذکر کیا گیا ہے، سورۃ النحل کی آیت ہے :- وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً ط (اور اللہ نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے!) سورۃ الفرقان میں ہے : وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۝ (اللہ وہی ہے جس نے انسانوں کو پانی سے پیدا کیا اور پھر اُن کو نسبی اور سسرالی رشتوں سے جوڑا!) — سورۃ الروم میں فرمایا :- وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تم میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم سکون پاؤ اور

تمھارے درمیان دوستی اور نرمی پیدا کی!) —نیز اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی ان آیات کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جن میں خاندانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مستقل اور دوامی قسم کی ہدایات اور نہایت واضح احکام ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم خاندانی ادارے کو بڑی اہمیت دیتا اور اسے صحیح شکل میں ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔

انسانی فطرت کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ ہے کہ اُسے ہمیشہ عزّت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اُس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کیا جائے جس سے اُس کی توہین اور تحقیر ہوتی ہو۔ چنانچہ آزادی اور حُرّیت میں اُسے اطمینان وسکون ملتا اور غلامی ومحکومی سے اُسے اذیّت وتکلیف پہنچتی ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم نے ہر انسان کا یہ انسانی حق ٹھہرایا ہے کہ وہ آزادی اور عزّت کے ساتھ زندہ رہے اور اُس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ ہو جو انسان کے ساتھ نہیں بلکہ حیوانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس حق پر قرآنِ حکیم کی جو آیات دلالت کرتی ہیں اُن میں سے ایک نہایت واضح آیت سورۃ الاسراء کی یہ آیت ہے :- وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ؕ (بے شک ہم نے بنی آدم کو عزّت وبزرگی دی اور اُن کو خشکی وتری کی سواریوں پر سوار کیا اور پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی مخلوقات میں سے بہتوں پر فضیلت دی) —اس آیت سے ہر انسان کا یکساں طور پر معزّز ومکرّم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں غلامی کے متعلق جو کچھ ہے وہ ایک تو خاص حالات کے تحت وقتی اور جوابی کارروائی کے طور پر ہے اور دوسرے ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ختم کر دینے کے لیے ہے۔ جوابی کارروائی کے متعلق قرآن مجید میں ارشادِ الٰہی ہے :- فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ (جو تم پر کوئی زیادتی کرے تم جواباً اس پر زیادتی کرو لیکن ٹھیک اتنی ہی جتنی اُس نے کی، اور اللہ کی ناراضگی سے بچتے رہو!)

اور تو اور قرآنِ حکیم نے دین کے معاملے میں بھی جبر واکراہ سے روکا ہے اس لئے کہ یہ انسانی کرامت اور حرّیت کے منافی ہے۔ چونکہ قذف انسانی عزّت وآبرو کے منافی تھا، لہٰذا قرآنِ حکیم نے اسے جرم قرار دیا اور اس کے لئے سزا تجویز کی۔ قرآن حکیم ہر انسان کیلئے جس آزادی کا حامی ہے، وہ تمام ایسے اُمور میں آزادی ہے جن سے کسی دوسرے انسان کو ضرر ونقصان نہ پہنچتا ہو اور اُس کی آزادی سلب نہ ہوتی ہو۔ لہٰذا ہر شخص کی آزادی دوسرے

شخص کی آزادی سے مقیّد ہوتی ہے۔ اور چونکہ قوانین کا مقصد تمام انسانوں کے حقوق کا تحفّظ ہوتا ہے لہٰذا قوانین کی پابندی سے آزادی کی صحیح حدود متعیّن ہوتی ہیں۔

نیز انسان کی یہ بھی فطرت ہے کہ جو معاملہ اُس سے تعلق رکھتا ہو، یعنی اُس کے اچھّے بُرے اثرات سے اُس کی ذات متاثّر ہوتی ہو وہ معاملہ اُس کی رائے سے طے پائے تو اُس سے اُس کو اطمینان ہوتا ہے، اور اگر اس کی رائے سے طے نہ پائے بلکہ کسی اور کی رائے سے طے پائے تو اُس سے اُس کو رنج اور دکھ ہوتا ہے لہٰذا قرآنِ حکیم یہ حکم دیتا ہے کہ جو اُمور و معاملات اجتماعی نوعیّت کے ہوں یعنی ان کے اچھے بُرے اثرات معاشرے کے تمام افراد پر پڑتے ہوں جیسے حکومت اور حکومتی معاملات، وہ امور و معاملات بلاواسطہ یا بالواسطہ سب کی رائے اور اجتماعی مشورے سے طے کئے جائیں تاکہ ضرر و نقصان کی صورت میں کوئی کسی پر الزام نہ دھر سکے اور کسی کو کسی سے شکایت و رنجش نہ ہو، قرآنِ حکیم کی آیت ہے :- اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ اور شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ___ بنیادی انسانی حقوق کی بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں مَیں نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ دراصل اُس ہدایت و رہنمائی کا ایک نامکمّل اور مجمل خاکہ ہے جو قرآنِ حکیم میں مکمّل پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد میں مختصر طور پہ دوسری قسم کے حقوق کے متعلّق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو مختلف اختیاری و غیر اختیاری روابط و تعلّقات کے تحت وجود میں آتے ہیں اور جن کے بالمقابل ہمیشہ فرائض ہوتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو اس دوسری قسم کے حقوق و فرائض کی تہہ میں یہ تصوّر کارفرما ہوتا ہے کہ "جس سے فائدہ اٹھایا جائے اُس کو فائدہ پہنچایا جائے!" اس قسم کے حقوق و فرائض کی فہرست بڑی طویل و عریض ہے۔ قرآنِ حکیم اور حدیث شریف میں اس قسم کے حقوق کی جو تفصیل ہے اس کے مطابق ایک انسان پر اُس کے اپنے نفس کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، بیوی و شوہر کے حقوق، بہن بھائیوں اور دوسرے قرابتداروں کے حقوق، پڑوسیوں اور اہلِ محلّہ کے حقوق، اہلِ شہر اور اہلِ وطن کے حقوق، مہمانوں کے حقوق، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق، حاکموں کے حقوق، رعایا کے حقوق، بحیثیت مسلمان کے دوسرے مسلمان کے حقوق، عمر میں بڑوں کے حقوق، چھوٹوں کے حقوق اور پھر بحیثیت انسان کے دوسرے انسانوں کے حقوق ہیں، یعنی ایک انسان پر بحیثیت انسان کے یہ حق ہوتا ہے کہ دوسرے ہر انسان کے

بنیادی انسانی حقوق کا تحفّظ کرے۔ اگر کسی کو وہ حقوق حاصل نہ ہوں تو دلوانے کی کوشش کرے۔ بعض احادیث میں جانوروں اور ہرے درختوں تک کے حقوق بھی بیان کیے گئے ہیں۔

چونکہ اس دوسری قسم کے حقوق و فرائض پر بعض علماءِ کرام نے مستقل کتابیں لکھی ہیں جن کے نام ہی الحقوق والفرائض ہیں۔ ان کتابوں سے اس قسم کے حقوق و فرائض کی نیز اُن قرآنی آیات اور احادیثِ نبویّہ کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے جن سے وہ حقوق و فرائض اخذ کیے اور سمجھے گئے ہیں۔ لہٰذا میں اُن کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا، اس لئے بھی کہ مقالہ زیادہ طویل نہ ہوجائے۔

قرآنِ حکیم نے اس دوسری قسم کے حقوق کی نگہداشت اور ادائیگی پر بھی بہت زور دیا ہے۔ کیونکہ اس پر معاشرتی اور اجتماعی تعلّقات کے استوار ہونے اور مستحکم و خوشگوار بننے کا دارومدار ہوتا ہے، اور اگر یہ حقوق ٹھیک طور پر ادا نہ ہوں تو اس سے معاشرتی و اجتماعی تعلّقات بگڑتے اور خراب ہوتے ہیں اور یہ کہ مطلوبہ عدل اجتماعی اُس وقت وجود میں آسکتا ہے جب پہلی اور دوسری دونوں قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہوں، اور چونکہ پہلی قسم کے حقوق کی حیثیت بنیادی ہے لہٰذا اگر کسی معاشرہ میں پہلی قسم کے انسانی حقوق محفوظ نہ ہوں تو محض دوسری قسم کے حقوق محفوظ ہوجانے سے کبھی عدلِ اجتماعی وجود میں آہی نہیں سکتا، لیکن اگر اس کے برعکس کسی معاشرے میں پہلی قسم کے حقوق محفوظ ہوں تو عدلِ اجتماعی کی بنیادیں قائم ہوجاتی ہیں اور اس سے دوسری قسم کے حقوق بروئے کار آنے کے لئے فضا بھی ہموار ہوجاتی ہے!

اب آخر میں میرے سامنے موضوعِ زیرِ بحث کا تیسرا پہلو ہے وہ یہ کہ عدل اجتماعی کو عمل میں لانے کے لئے قرآن حکیم سے جو طریقِ کار مفہوم ہوتا ہے، وہ کیا ہے؟ سو اس بارے میں نزولِ قرآنِ حکیم کی ترتیب اور سنّت رسول کریم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سے جو کچھ مَیں سمجھ سکا ہوں وہ یہ کہ ایک طرف نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع سے ایمانی عقائد کی تعلیم و تبلیغ عام کی جائے اور اس تعلیم و تبلیغ میں ایمانی عقائد کے اس پہلو کو بطورِ خاص واضح کیا جائے جو انسان کی دنیوی زندگی کی صلاح و فلاح سے تعلّق رکھتا ہے۔ مثلاً اس وسعت اور عالمگیریّت کو اجاگر کیا جائے جو ایمانی عقائد کے ذریعہ انسان کے اخلاقی احساسات میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر جو لوگ ایمانی عقائد سے مشرّف ہوں انہیں اسلامی عبادات کا عادی اور خوگر بنایا جائے تاکہ اُن کے ذہنوں میں ایمانی

عقائد اور اُن سے تشکیل شدہ اخلاقی احساسات ہمیشہ زندہ اور تازہ رہیں اور وہ ذہنی ماحول قائم ہو اور قائم رہے جو عدلِ اجتماعی کے عمل میں آنے کے لیئے ضروری ہے۔

دوسری طرف قرآن حکیم کے ہدایت کردہ نظامِ حقوق اور ضابطۂ قوانین کی تعلیم عام کی جائے اور علمی و عقلی طریقہ سے یہ واضح کیا جائے کہ اس کے ذریعے کس طرح انسان کے تمام فطری تقاضوں کی تکمیل اور تسکین ہوسکتی اور کس طرح انسان کو خوف و حزن سے پاک وہ حیاتِ طیّبہ حاصل ہوسکتی ہے جس کی اُس کے اندر طلب و جستجو ہے اور جس کی تلاش میں وہ حیران و سرگردان ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اُس کو مل نہیں رہی۔

تیسری طرف ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے جس کے وجود کا اصل مقصد قرآنی نظامِ حقوق اور ضابطۂ قوانین کو عملاً نافذ کرنا اور ان کا تحفّظ کرنا ہو، اور اس سلسلہ میں حکومت کی پالیسی اور حکمتِ عملی یہ ہو کہ ہر قانون کے نفاذ سے پہلے یہ دیکھے کہ اُس کے لیئے سازگار ذہنی و خارجی فضا موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود نہ ہو تو اُس کے نفاذ کو اُس وقت تک معرضِ التواء میں رکھا جائے جب تک کہ موافق فضا پیدا نہ ہو جائے۔ البتہ التوار کے اس درمیانے وقفہ میں ضروری ہوگا کہ اجتماعی صلاح و مشورہ سے ایسے عبوری اور وقتی احکامات تجویز کرے جو موجودہ ذہنی و خارجی فضا کے مطابق اور قابلِ عمل ہوں یعنی جن کو نافذ کرنے سے مخالف ردِّ عمل ظاہر ہونے کا اندیشہ نہ ہو، نیز وہ عبوری اور وقتی احکامات ایسے ہوں جن پر عمل کرنے کے نتیجہ میں موجود ظلم و فساد میں کچھ نہ کچھ کمی ہوسکتی اور اجتماعی حالات نسبتۃً بہتر ہوسکتے ہوں۔ اسی طرح اس حکومت پر یہ بھی لازم ہوگا کہ وہ اَلْاَهَمُّ فَالْاَهَمُّ کے اصول پر عمل کرے جو قوانین بنیادی اور زیادہ اہم ہوں انہیں پہلے اور نسبتۃً کم اہم اور فروعی قسم کے ہوں انہیں بعد میں نافذ کرے کیونکہ بنیادی خرابی کے ہوتے ہوئے صرف ان اوپری خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش جو اس بنیادی خرابی کے بطن سے جنم لیتی ہیں ایک ناکام اور لاحاصل کوشش ہوتی ہے جبکہ بنیادی خرابی کے ختم ہو جانے سے وہ خود بخود ختم ہو جایا کرتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیئے مذکورہ طریقِ کار، طویل وقت اور مسلسل جدّ و جہد چاہتا ہے لیکن چونکہ اس سے جو صلاح و درستگی عمل میں آتی ہے وہ عارضی اور وقتی نہیں بلکہ پائیدار اور مستقل ہوتی ہے کیونکہ اس میں مخالف ردِّ عمل کا اندیشہ نہیں ہوتا جس کا نتیجہ ہمیشہ فائدہ کم اور ضرر زیادہ کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے، اور چونکہ اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ صلاح

گو کم اور دیر میں ہو لیکن جو ہو وہ پائیدار اور مستقل ہو، بالفاظِ دیگر اصلاح کی رفتار اگرچہ دھیمی اور سست ہو لیکن جو قدم آگے بڑھے وہ کہیں بھی پیچھے نہ ہٹے اور منزل قریب تر ہوتی جائے، درا صل یہی وہ مصلحانہ اور حکیمانہ طریقِ کار ہے جو ہمیشہ حضرات انبیاء علیہم السّلام نے انسانی معاشرے کی اصلاح کے لئے اختیار فرمایا لہٰذا اسلام بھی مسلمان مصلحین کو یہی طریقِ کار اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کامیابی اسی کا نام ہے کہ ایک مسلمان پیغمبرانہ طریقِ کار کے مطابق جدّ و جہد کرتے ہوئے اپنی زندگی ختم کر دے۔ کامیابی اس کا نام نہیں کہ وہ جن نتائج کے لئے جدّ و جہد کر رہا تھا وہ مشہود طور پر اُس کے سامنے آئیں اور وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھے ——— !

غرضیکہ ایک مسلمان صرف اس کا مکلّف ہے کہ وہ پیغمبرانہ طریقِ کار کے مطابق دنیا سے ظلم و فساد کو مٹانے اور اُس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے مسلسل جدّ و جُہد کرتا رہے۔ اس کا مکلّف نہیں کہ وہ ہر طریقہ سے ظلم و فساد کو مٹا کر اس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرے خواہ وہ طریقہ اُس غرض و غایت کے منافی ہی کیوں نہ ہو جس کی خاطر ظلم و فساد کو مٹانے اور عدل و انصاف کو قائم کرنے کا حکم ہے۔

* * *

انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی
کے مقاصد کی وضاحت کے لئے مطالعہ فرمائیں
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ
کرنے کا اصل کام
تالیف
ڈاکٹر اسرار احمد

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

تصانیف امام حمید الدین فراہیؒ

○ مجموعہ تفاسیر فراہیؒ		ہدیہ ۲۴/- روپے
○ اقسام القرآن	اُردو ترجمہ الامعان فی اقسام القرآن	ہدیہ ۳/۷۵ 〃
○ ذبیح کون ہے ؟	اُردو ترجمہ القول الصحیح فی من ہو الذبیح	ہدیہ ۴/۵۰ 〃

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

○ سلسلۂ تدبّر قرآن :

● مبادیٔ تدبّر قرآن : تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز		ہدیہ ۸/- روپے
● مقدمہ تدبّر قرآن و تفاسیر آیت بسم اللہ و سورۃ فاتحہ		ہدیہ ۳/- 〃
● تدبّر قرآن جلد اوّل	مشتمل بر مقدمہ و تفسیر از ابتدا تا سورۂ آل عمران	〃 ۵۰/- 〃
● تدبّر قرآن جلد دوم	مشتمل بر تفسیر سورۂ نساء تا سورۂ اعراف	〃 ۵۰/- 〃
● تدبّر قرآن جلد سوم	مشتمل بر تفسیر سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل	ہدیہ ۵۰/- 〃
● تدبّر قرآن جلد چہارم	مشتمل بر تفسیر سورۂ کہف یا سورۂ قصص	۵۰/- 〃
○ حقیقتِ دین	مشتمل بر حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ، حقیقت نماز	ہدیہ ۱۶/- 〃
○ دعوت دین اور اس کا طریق کار		ہدیہ ۱۰/- 〃
○ اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار		ہدیہ ۱/۲۵ 〃
○ قرآن اور پردہ		ہدیہ ۱/- 〃
○ اسلامی قانون کی تدوین		〃 ۵/ 〃

تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

○ اسلامی تحقیق کا مفہوم ، مدّعا اور طریق کار	قسم اعلیٰ ۱/۵۰، ادنی ۱/-

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمدؒ

○ تحریکِ جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ	۶/- روپے
○ اسلام کی نشأۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام	۱/- ″
○ مُسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	۲/- ″
○ ″ ″ ″ ″ ″ انگریزی	۳/- ″
○ ″ ″ ″ ″ ″ (عربی)	۴/- ″
○ عظمتِ صوم	-/۷۵ ″
○ علامہ اقبال اور ہم	۱/۵۰ ″
○ راہِ نجات : سورہ والعصر کی روشنی میں	قسم اعلیٰ ۲/-، ادنی ۱/- ″
○ قرآن اور امن عالم	۰/۷۵ ″
○ دعوت الیٰ اللہ	۱/- ″
○ آیت الکرسی : ایک نشری تقریر	۰/۳۰ ″
○ دعوتِ بندگیٔ رب	(زیر طبع)
○ فریضۂ شہادت حق	″
○ مُسلمانوں پر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حقوق	″
○ اسلام اور پاکستان: ایک سیاسی وثقافتی جائزہ	″

تالیف پروفیسر یوسف سلیم چشتی

○ اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش	۵/- ″

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حِکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیوں کر؟
اسباب کرے جمع خدا ہی کا ہے یہ کام!
طالب ہو خدا سے تو، دعا ہی کا ہے یہ کام!

بعد میں اسی 'دارالاسلام' میں علامہ مرحوم ہی کے ایما پر مولا
سیدابوالاعلیٰ مودودی نے مکونت اختیار کر لی اور اسے تقسیم ملک تک
مرکز جاعت اسلامی کی حیثیت حاصل رہی ۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا او
مرکز جاعت تو اچھرہ لاہور میں 'پناہ گزیں' ہوگئے اور چوھدری صاحب مرحو
جوہر آباد ضلع سرگودھا میں مقیم ہوگئے ۔ اس مرد قلندر نے وہاں بھی
'دارالاسلام ٹرسٹ' قائم کر دیا اور ضروری عمارات بھی از سرنو تعمیر کر لی
اور بقیہ پوری زندگی اس انتظار میں گذاردی کہ اقبال کا کوئی مرد مومن وہا
آڈیرا لگائے اور ان کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو وقف
کر دے ۔ لیکن وہ بھی اپنے مرشد علامہ اقبال کی طرح اپنی اس خواہش ک
سینے میں لیے ہوئے ہی راہئی ملک بقا ہو گئے ، چوہدری صاحب مرحوم فرما
کرتے تھے کہ کچھ خاص قسم کے پرندوں کو متوجہ کرنے کے لئے ایک
موثر تدبیر یہ ہوتی ہے کہ جیسے گھونسلے انہیں پسند ہوں ویسے بنادیئے جائی
وہ خود بخود آ کر بسیرا کر لیں گے ۔ میں نے یہ دارالاسلام کا 'گھرونده ، بنا د
ہے شاید کبھی اقبال کا "شاہین" یہاں آ کر بسیرا کر لے ۔ لیکن تا حال صور
وھی ہے کہ ع اے بسا آرزو کہ خاک شده !

ان سطور کے ناکارہ و نا چیز راقم کو علامہ مرحوم کے ساتھ جو نسب
معنوی حاصل ہے اس کا بیان تحصیل حاصل شمار ہو گا ۔ یہاں صرف اس قدر عرض
کر دینا مناسب ہے کہ قرآن اکیڈمی کا منصوبہ جو راقم نے جون ۱۹۶۷
میں ماہنامہ میثاق ، کے ادارتی صفحات میں شائع کیا تھا اور جو دس سال ک
محنت و مشقت اور اللہ کے فضل و کرم سے اب عالم واقعہ میں نمودار ہو
نظر آرہا ہے اس کا نقشۂ وہی ہے جو علامہ اقبال مرحوم کے پیش نظر تھا
اور اگر اس کے ذریعے دین کی کوئی بھی چھوٹی بڑی خدمت ہو سکی تو یہ
در اصل علامہ مرحوم ہی کا فیض معنوی ہوگا ۔

بظاہر احوال تو کام بہت بڑا اور مرحلہ سخت مشکل ہے لیکن جس طر
علامہ مرحوم کے ۱۹۳۰ء کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر ۱۹۴۷ء میں قی
پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوئی اسی طرح کیا عجب کہ ان کے اس دوسر
خواب کے تعبیر کے ظہور کا وقت بھی تقویم الٰہی کی رو سے قریب آ گیا ہو ۔

شاہاں چہ عجب گربنوا زند گدارا !

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 26 | DECEMBER 1977 | No. 6

مکتوب حکیم فیض عالم صدیقی بنام ڈاکٹر اسرار احمد

محترم المقام ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ۔ چند ماہ سے شمس الاسلام اور میثاق میں ایک دوسرے کے خلا
کچھ ایسی باتیں شائع ہو رہی ہیں جو ایسے جرائد کی پالیسی کی نقیض ہیں ج
بنیادی اور اولین مقصد صرف تعمیری ہے ۔ اکثر غلط فہمیاں بعض اوقات کا
غیر محسوس انداز میں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا نتیجہ چنداں خوشگوار نہیں ۔ تا
میں نے صاحبزادہ ابرار احمد صاحب کی خدمت میں بھی عرض کر دیا ہے ،
انہوں نے قبول بھی کر لیا ہے ۔ اب آپ کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ
کے بعد اس سلسلہ کو بالکل بند فرمادیں ۔ شمس الاسلام اور میثاق کے قارئین
لیے یہ سلسلہ اچھے اثرات پیدا کرنے کی بجائے سوائے اس کے کچھ نہیں کہ
افراد شمس الاسلام کی طرفداری کریں گے اور چند اصحاب میثاق کی اور نت
سراسر تشتت و افتراق ۔ امید ہے کہ آپ میثاق کے ذریعے اپنے قارئین کو
فرمائیں گے کہ میثاق اس سلسلے کو ختم کر رہا ہے ۔ و اسلام

حکیم فیض عالم
محلہ مستریاں جہلم

ان شاءاللہ العزیز ”ماھنامہ میثاق“ محترم حکیم صاحب کے مشورے پر عمل کر

مزید براں ”اسلام اور پاکستان“ کے موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار ا
کا جو مضمون اس شمارے میں شائع ہونا تھا وہ ان شاءاللہ جنوری ۷۸ء
شمارے میں پیش ہوگا ۔ ج ۔ ر (مرتب)

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے بااہتمام چودھری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس
شائع فاطمہ جناح سے چھپوا کر مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ،
۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور سے شائع کیا